ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی
تحقیقات اسلامی
علی گڑھ

(جنوری - مارچ ۱۹۸۲ء)

نگران
مولانا صدرالدین اصلاحی

مدیر
سید جلال الدین عمری

فی شمارہ پانچ روپے
قیمت سالانہ ہندوستان سے بیس روپے
پاکستان سے پچاس روپے (ہوائی ڈاک سے)
دیگر ممالک سے ۸ ڈالر (" ")

خط وکتابت کا پتہ
مینجر تحقیقات اسلامی، پان والی کوٹھی - دودھ پور - علی گڑھ، یوپی، بھارت 202001

طابع وناشر: سید جلال الدین عمری نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی پان والی کوٹھی علی گڑھ سے شائع کیا۔

سہ ماہی **تحقیقات اسلامی** علی گڑھ

جلد ۱   جنوری ۱۹۸۲ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۲ھ   شمارہ ۱

حرف آغاز
سید جلال الدین عمری

قرآن و حدیث
قصۂ آدم و حوّا — سید جلال الدین عمری

تحقیق و تنقید
تاریخ اسلام میں فن شانِ نزول کی اہمیت — ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی
"وہ نبی" جس کا انتظار تھا — ڈاکٹر محمد ذکی

بحث و نظر
مسلمان باپ کی ذمہ داریاں — مولانا صدر الدین اصلاحی
تصور مساوات کا پس منظر — جناب سلطان احمد اصلاحی
کمزور کے مسائل اسلام نے حل کیے ہیں — سید جلال الدین عمری

ترجمہ و تلخیص
تعدّد ازدواج پر پابندیوں کا مسئلہ — ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری

تعارف و تبصرہ
سلطان احمد اصلاحی

اس شمارہ کے لکھنے والے

(۱) ڈاکٹر محمد یلسین مظہر صدیقی: شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ندوۃ العلما لکھنؤ سے عالمیت کی سند حاصل کرنے کے بعد جدید تعلیم کی طرف توجہ کی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے کیا اور یہیں سے امیر خسرو دہلوی کی 'اعجاز خسروی' پر تحقیقی کام کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی آپ حسب ذیل تصنیفی کام کر چکے ہیں۔

ORGANISATION OF GOVERNMENT UNDER THE PROPHET

حضرت ولید بن عقبہ اموی، بیات اور عصر ان کے علاوہ ہند و پاک کے مختلف جرائد میں ۲۵ سے زیادہ مضامین شائع کرا چکے ہیں۔

(۲) ڈاکٹر محمد ذکی: شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پندرہویں اور سولہویں صدی میں شمالی ہند کی مسلم سوسائٹی' پر تحقیقی کام کرکے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کیا ۱۹۷۱ء میں 'مغربی تہذیب - آغاز و انجام' لکھی جو اپنے موضوع پر بڑی اہم اور وقیع کتاب ہے اردو اور انگریزی میں بہت سے مقالات شائع کرا چکے ہیں۔

(۳) مولانا صدرالدین اصلاحی

برصغیر کے مشہور عالم دین۔ جماعت اسلامی ہند کے رکن شوریٰ۔ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کے صدر۔ ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف، جن میں سے بعض کا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اہم دینی اور علمی موضوعات پر متعدد مقالات لکھے۔ ان میں سے بعض رسائل اور کتابچوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۴) جناب سلطان احمد اصلاحی

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے فارغ مسلم یونیورسٹی سے انگلش میں بی اے، ادارہ تصنیف کے تربیت یافتہ اور اب اس کے رفیق۔ 'مومنانہ زندگی کے اوصاف' اور 'اسلام کے نظریہ مساوات' پر آپ کی تصنیفات منتظر اشاعت ہیں۔ محمد ابوزہرہ مصری کی کتاب 'المجتمع الانسانی فی ظل الاسلام' کا اردو ترجمہ 'انسانی معاشرہ - اسلام کے سایہ میں' کے عنوان سے کیا جو چھپ رہا ہے۔

(۵) ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری: پروفیسر اور صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ دین نکلٹی آف تھیالوجی ڈاکٹریٹ کے لئے زمخشری اور اس کی تفسیر الکشاف عن حقائق التنزیل پر جو تحقیقی کام کیا وہ ہمارے سوانحی لٹریچر میں ایک اضافہ ہے۔ آپ کی کتاب 'تجارتی سود - اسلامی نقطہ نظر سے' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انگریزی اور اردو دونوں میں مضامین لکھتے ہیں جن میں سے بعض شائع ہو چکے ہیں، بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔

(۶) سید جلال الدین عمری: سکریٹری ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی و مدیر سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

حرفِ آغاز

سیدجلال الدین عمری

اسلام نے جہاں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ وہ خالقِ کائنات کا دین ہے، اس کے حق میں مضبوط دلائل بھی فراہم کیے ہیں۔ ان دلائل میں ہر دور کے اونچے سے اونچے انسان کو اپیل کرنے اور اس کے دل و دماغ کو پوری طرح مطمئن کرنے کی بھرپور قوت اور صلاحیت موجود ہے۔ جس طرح ہر شخص کا ایک ذہنی اور فکری سانچہ ہوتا ہے اسی طرح ہر دور کا بھی مخصوص اندازِ فکر ہوتا ہے۔ بہت سے وہ افکار و خیالات جو ماضی میں انسانی فکر پر چھائے ہوئے تھے اور جن پر لمبی چوڑی بحثیں ہوتی تھیں آج ان کی سرے سے کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہی اور ان کی جگہ دوسرے افکار و خیالات نے لے لی۔ افکار و خیالات کی تبدیلی سے مسائلِ حیات ہی نہیں بدلتے بلکہ ان کے اظہار کے طریقے بھی بدل جاتے ہیں۔ زبان، نیا اسلوب اور نئی طرزِ ادا اختیار کرتی ہے، نئی اصطلاحیں وضع ہوتی ہیں، نئی منطق وجود میں آتی ہے اور بحث و نظر کا نیا انداز اور نیا ڈھنگ جنم لیتا ہے۔ لوگ اس تبدیلی کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ قدیم اندازِ بیان اور طریقۂ تعبیر ان کے لیے نامانوس اور ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر مسئلہ کو اپنے دور کی زبان و بیان ہی میں سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام کو بھی ہر دور کی علمی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور جو سوالات پیدا ہوتے رہے ان کا جواب بھی اس وقت کے استدلالی انداز میں دیا گیا۔ یہ کوشش کسی ایک میدان میں محدود نہیں تھی بلکہ اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ اس میں تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ وغیرہ بہت سے علوم داخل تھے۔ اس سلسلہ میں امت کے علماء، محققین اور مجددین نے جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، اسلامی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان بزرگوں نے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، اسلام کو اپنے عہد کی علمی زبان

ہیں اور اتنے اونچے معیار سے پیش کیا کہ کسی بھی شخص کے لیے یہ کہنا آسان نہیں رہا کہ اسلام ہمارے دور کے علمی اور عقلی معیار پر پورا نہیں اترتا اور اس کے تقاضے پورے نہیں نہیں کرتا۔ یہ ان کا اتنا بڑا احسان ہے کہ امت اس سے کسی طرح سبک دوش نہیں ہوسکتی۔

تاریخ کے اسی عمل کو آج پھر دہرانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اسے آج کی علمی و فکری سطح سے پیش کیا جائے۔ جن افکار و نظریات کی ہر سو حکم رانی ہے ان کے مقابلہ میں اسلامی نظریات کی برتری ثابت کی جائے اور ان ذہنی و فکری الجھنوں کو اسلام کی روشنی میں حل کیا جائے جن میں آج پوری دنیا گرفتار ہے۔ یہ دیکھ کر دلی مسرت محسوس ہوتی ہے کہ امت میں اس کا احساس جاگ رہا ہے اور مختلف محاذوں پر اسلام کی بڑی اچھی علمی خدمات انجام پا رہی ہیں۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں ———

'ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی' بھی اس میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ کام اتنا بڑا ہے اور اس کے اتنے مختلف پہلو ہیں کہ بہت سے افراد اور ادارے مل کر بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اور نئے نئے اداروں کی بہر حال ضرورت رہے گی۔ ادارہ کی کوشش ہوگی کہ خالص علمی انداز میں اسلام کا وسیع تعارف کرائے، اس کے اخلاقی، روحانی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی پہلوؤں پر تحقیقی لٹریچر فراہم کرے دورِ جدید نے اسلام کی نسبت سے جو سوالات پیدا کیے ہیں ان کا جواب دے اور اسلام کو سمجھنے کی راہ میں آج جو علمی دشواریاں پیش آرہی ہیں انہیں دور کرے۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا کام نہیں ہے بلکہ ایک بڑی علمی مہم ہے۔

اس مہم میں ادارہ ان تمام اصحاب علم اور ارباب قلم کا تعاون چاہتا ہے جو اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی اہمیت اور افادیت محسوس کرتے ہیں۔ ان کا تعاون ادارہ کے لیے عزت افزائی کا باعث ہوگا اور وہ ان کا بے حد ممنون و مشکور ہوگا۔ یہ کوئی خاکساری یا تکلف کی بات نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اسلامی مفکرین کے تعاون ہی

سے یہ مہم سر کی جا سکتی ہے۔
اس کام کے لیے جن اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور مادی وسائل کی ضرورت ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ ادارہ کو حاصل نہیں ہیں، لیکن اس امید پہ کام کا آغاز کر دیا گیا ہے کہ جس خدائے ذوالجلال نے اس کی توفیق اور ہمت عطا کی ہے وہ اس کی صلاحیت بھی دے گا اور ضروری وسائل بھی فراہم کرے گا۔ وہ چاہے تو بے مایہ انسانوں سے بھی بڑے سے بڑا کام لے سکتا ہے۔ کوئی بھی چیز ناممکن اس کے لیے نہیں ہے۔

انہ علی کل شیئ قدیر

'ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی' کے سامنے جو وسیع کام ہے، اسی کا ایک حصہ سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' کا اجرا بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں بہت سے رسائل اور جرائد چھپتے ہیں، لیکن ان میں بڑی تعداد ان رسائل کی ہے جن کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے۔ رسائل کی اس لمبی چوڑی فہرست میں صرف دو چار ہی رسائل ایسے ہیں جن کا معیار اونچا ہے اور جو پڑھے لکھے حلقہ میں پہونچتے ہیں، ان کے مقالات پر توجہ دی جاتی ہے اور کبھی کبھی وہ نقد و نظر اور بحث و تنقید کا موضوع بھی بنتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک ایسے رسالہ کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کا واحد مقصد یہ ہو کہ اسلام کو دور جدید کے علمی معیار کے مطابق پیش کیا جائے۔ جس کے مقالات اور مضامین سے اسلام کے کسی نہ کسی پہلو کی وضاحت یا اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا ازالہ ہو اور اس کی علمی سطح بھی ایسی ہو کہ اس کے مباحث کو نظر انداز نہ کیا جا سکے۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ 'تحقیقات اسلامی' کو اسی معیار کا مجلہ بنایا جائے۔ اس کے مقالات اور مضامین کا انداز زیادہ سے زیادہ علمی اور تحقیقی ہو، سطحی اور غیر علمی چیزیں یا نہ شائع کی جائیں اور جو بات کہی جائے وہ تحقیق کے ساتھ کہی جائے۔

اس بات کی بھی کوشش کی جائے گی کہ اس کے مضامین میں تنوع ہو۔ اللہ نے چاہا تو اس میں قرآن و حدیث کی تشریح بھی ہوگی، اسلام کی روشنی میں مختلف

موضوعات پر تحقیق و تنقید بھی ہوگی، عقائد و نظریات سے بحث بھی ہوگی، تاریخ اور سیرت کا مطالعہ بھی ہوگا، اخلاقی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی علوم کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ بھی لیا جائے گا اور خالص فقہی مباحث بھی ہوں گے۔

اللہ کا شکر ہے کہ رسالہ کو بعض اچھے اور نامور اصحاب قلم کا مستقل تعاون حاصل ہے۔ اس لیے توقع ہے کہ اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا رہے گا اور اس کا ہر شمارہ پچھلے شمارہ سے بہتر ہوگا۔ ادارہ اپنے ان قلمی معاونین کا شکر گزار ہے۔ اس کے ساتھ ان تمام حضرات سے جو کسی بھی موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیقی اور تنقیدی کام کر رہے ہیں تعاون کی پرخلوص درخواست ہے۔ رسالہ ان کا اپنا ہے اس لیے امید ہے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون سے دریغ نہیں کریں گے ——————

رسالہ کے ساتھ ادارہ نے اپنا اشاعتی پروگرام بھی شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اسلامی عقائد سے متعلق خاکسار مدیر کے ایک مضمون کا انگریزی ترجمہ ISLAM THE UNIVERSAL TRUTH کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ترجمہ کی خدمت برادرم جناب اسرار احمد خاں صاحب نے انجام دی ہے۔ اللہ نے چاہا تو تراجم کا مزید سلسلہ جاری رہے گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارہ کو اس کے مقاصد میں کامیابی عطا کرے، اس راہ کی مشکلات کو دور کرے اور اس کے کارکنوں کو صبر و ثبات اور استقامت بخشے،

نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

قرآن وحدیث [۱]

قصہ آدم وحوا قرآن میں

سید جلال الدین عمری

اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ خاص سے ایک مخلوق پیدا کی۔ اس میں اپنی روح پھونکی اور اسے اشیاء کا علم عطا کیا۔ یہ مخلوق تھی تو خاکی لیکن فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اس کے سامنے سر جھکا دیں۔ اس کے لئے زمین و آسمان اور بحر و بر مسخر کر دیئے گئے۔ اسے غیر معمولی قوتیں اور صلاحتیں عطا کی گئیں۔ اور ساری مخلوقات میں اس کا تفوق اور برتری قائم کر دی گئی۔ یہ تھے حضرت آدم علیہ لیکن ان کی شخصیت میں ایک خلا تھا اس خلا کو پر کرنے کے لئے انھیں ایک جوڑے کی ضرورت تھی۔ ورنہ ان کی شخصیت ادھوری رہ جاتی۔ چنانچہ یہ جوڑا بھی فراہم کیا گیا۔ یہ جوڑا ان ہی سے نکالا گیا تھا۔ کیونکہ کوئی دوسری نوع یا دوسری مخلوق جو ان کی ساخت اور فطرت سے مناسبت نہ رکھتی ہو ان کا جوڑا نہیں بن سکتی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ حضرت آدمؑ سے ان کا یہ جوڑا کیونکر نکالا گیا؟ ہو سکتا ہے یہ قدرت کا کوئی غیر معمولی کرشمہ ہو اور اسکا بھی امکان ہے کہ اس بات کی تعبیر ہو کہ جن اجزاء سے حضرت آدمؑ کا خمیر تیار ہوا تھا اور جن صفات اور خصوصیات کے وہ حامل تھے وہی اجزاء اور خصوصیات ان کے جوڑے میں بھی تھیں۔ بہرحال یہ جوڑا ایسا تھا جس سے حضرت آدمؑ کو سکون و چین اور راحت ملی۔ یہ حضرت حواؑ تھیں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ
وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا
(الاعراف ۱۸۹)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا
اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اسکے پاس سکون حاصل کرے

اب ان کی زندگی کا سفر ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ حضرت آدمؑ کو جنت میں رکھا گیا۔ حوا ساتھ تھیں۔ دونوں کو جنت کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی اجازت تھی۔ صرف ایک

[۱] اس عنوان کے تحت کسی ایک موضوع سے متعلق قرآن اور حدیث کی تعلیمات وقتاً فوقتاً پیش کی جاتی رہیں گی۔

صرف ایک درخت تھا جس کے قریب پھٹکنے سے بھی منع کیا گیا تھا۔ لیکن شیطان نے انھیں دھوکا دیا اور انھوں نے اس شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں اس لباس سے محروم ہو گئے جو جنت میں عطا کیا گیا تھا۔ اور وہاں کے پتوں سے اپنے جسم کو چھپانے پر مجبور ہو گئے۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۔ (الاعراف: ۲۲)

پھر جب انھوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے سامنے ان کی شرمگاہیں کھل گئیں اور وہ اپنے اوپر (ستر پوشی کے لئے) جنت کے پتے جوڑنے لگے۔

غلطی دونوں سے ہوئی تھی لہٰذا سرزنش بھی دونوں ہی کو کی گئی۔

وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ

ان کے رب نے پکارا کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے۔

آدمؑ اور حوا دونوں ہی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے اللہ سے معافی چاہی۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (الاعراف: ۲۳)

دونوں نے کہا اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر زیادتی کی اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور تباہ ہو جائیں گے۔

ان کی توبہ قبول ہوئی اور ان کو زمین پر بھیج دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ شیطان ان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ وہ ان کا دشمن ہے اور انھیں اللہ کی عبادت سے پھیرنے کی مسلسل کوشش کرے گا۔

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۔ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ (الاعراف ۲۴)

اللہ نے فرمایا تم (یہاں سے زمین پر) اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ تمہارے لئے زمین ہی میں رہنے کی جگہ ہے اور ایک خاص وقت تک زندگی کا سامان ہے۔ اسی میں تم زندہ رہو گے، اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔

اس کے ساتھ انھیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ شیطان انھیں گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت اور رہنمائی بھی ضرور فرمائے گا۔ اس ہدایت کی پیروی کرنے والے انعام واکرام کے

مستحق ہوں گے اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے ان پر خدا کا عتاب نازل ہوگا چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○ (البقرہ ۳۸، ۳۹)	ہم نے انھیں حکم دیا۔ اترجاؤ تم سب یہاں سے، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو اس کا انکار کریں گے اور ہماری آیتوں کی تکذیب کریں گے وہ آگ میں جانے والے ہیں۔ اسمیں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان ہدایات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آدم وحوا کو زمین پر بھیج دیا۔ ان دونوں سے یہاں ان کی نسل چلی۔ ان جیسے بے شمار مرد اور عورتیں پیدا ہوئیں۔ ان کے درمیان رشتے اور تعلقات قائم ہوئے مختلف قومیں اور قبیلے وجود میں آئے اور آدم وحوّا کی اولاد پورے روئے زمین پر پھیل گئی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ○ (النساء: ۱)	اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے اور اللہ سے ڈرو جس کے ذریعہ تم ایک دوسرے سے مدد طلب کرتے ہو اور رشتوں کا احترام کرو۔ بے شک اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

انسانِ اوّل اور اس کے جوڑے کی تخلیق، جنت میں ان کے قیام، ان کی غلطی، ان کی توبہ، شیطان کی ان سے عداوت، خدا کی طرف سے ان کی ہدایت کا انتظام، زمین پر ان کی آمد اور ان کی نسل کے پھیلنے کا قرآنِ مجید نے جس طرح ذکر کیا ہے اس میں کہیں سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون برتر ہے اور کون کمتر ہے، کس کا درجہ اونچا اور کس کا مقام پست اور فروتر ہے۔ یہ پوری داستان آدم وحوا کے گرد اس طرح گھومتی ہے کہ وہ ایک حیثیت اور ایک درجہ کے معلوم ہوتے ہیں۔

بائبل میں بھی حضرت آدم وحوّا کا یہ واقعہ بیان ہوا ہے، لیکن اس سے حضرت حوا کی بالکل

ایک دوسری ہی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ نسل انسانی کے پہلے فرد حضرت آدمؑ جنت میں عیش و راحت کی زندگی گذار رہے تھے کیونکہ وہ خدا کے فرمانبردار تھے لیکن ان کی بیوی حوا نے انھیں سب سے پہلے خدا کی نافرمانی پر اکسایا اور ان کو ایک ایسا پھل کھلایا جس کے کھانے سے خدا نے انھیں روکا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی نعمتوں سے محروم کردیئے گئے اور ان کو مشقت اور تکلیف کی زندگی نصیب ہوئی۔

عہدنامہ قدیم میں ہے کہ جب خدائے تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے دریافت کیا کہ "کیا تونے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟" تو آدمؑ نے جواب دیا کہ "جس عورت کو تونے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔"

تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حوّا سے کہا:

"میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا" (پیدائش ۱/۳)

دوسرے الفاظ میں حوّا نے آدمؑ کو گمراہ کرکے جس جرم کا ارتکاب کیا تھا خدا کی طرف سے اس جرم کی یہ سزا ملی کہ وہ حمل اور ولادت کی تکلیف میں مبتلا کی گئی۔ اور ہمیشہ کے لئے اس پر مرد کا اقتدار اور غلبہ قائم کردیا گیا اب قیامت تک مرد، عورت پر حکومت کرتا رہے گا۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ اس واقعہ کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ و حوّا زندگی کے سفر میں گو ساتھ تھے لیکن ذمہ دار حضرت آدمؑ تھے۔ حضرت حوّا نے جو کچھ کیا ان کی تبعیت میں کیا۔ اس سے خود بخود اس خیال کی تردید ہوجاتی ہے کہ حضرت حوّا نے حضرت آدمؑ کو گمراہ کیا تھا۔

ارشاد ہے:-

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ ۝ فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ

ہم نے اس سے پہلے آدم کو تاکید کردی تھی لیکن وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہیں پایا۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو وہ سجدے میں گر پڑے مگر ابلیس نے انکار کردیا ہم نے کہا اے آدم! یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے

فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰآدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۝ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ۔

(طٰہٰ ۱۱۶ - ۱۲۸)

کہیں یہ جنت سے تم دونوں کو نہ نکال دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ یہاں تمہارے لئے ہر طرح کی آسائش ہے کہ تمہیں نہ بھوک ستاتی ہے نہ تم برہنہ رہتے ہو، نہ پیاس لگتی ہے اور نہ گرمی پریشان کرتی ہے شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ اے آدم کیا میں تمہیں وہ درخت نہ بتاؤں کہ جس کے کھانے سے تم ہمیشہ زندہ رہو اور ایسی بادشاہی تمہیں ملے جو کبھی ختم نہ ہو (بس وہ اس کے دھوکے میں آگیا) اور وہ (اور اس کی بیوی) دونوں اس درخت کا پھل کھا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ان کی شرمگاہیں ان کے سامنے کھل گئیں اور وہ جنت کے پتوں سے انھیں چھپانے لگے (اس طرح) آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اس کے رب نے اسے چن لیا اس کی توبہ قبول کی اور اسے راہ دکھائی۔ ارشاد ہوا اتر جاؤ تم سب یہاں سے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ پھر اگر تمہارے پاس میری ہدایت پہونچے تو جو شخص میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ گم راہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا اور جو میری نصیحت سے اعراض کرے گا اسکے لئے تنگی کی زندگی ہوگی اور ہم اسے قیامت میں اندھا بنا کر اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے رب تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا جبکہ میں دیکھنے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اسی طرح ہماری آیتیں تم تک پہنچی تھیں لیکن تو نے انھیں بھلا دیا۔ اسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے۔

اس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو حد سے بڑھ
جائے اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لائے اور آخرت
کا عذاب زیادہ سخت اور باقی رہنے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے پہلے ہی روز کہہ دیا تھا کہ شیطان ان کا اور ان کی بیوی کا دشمن ہے۔ اس لئے انھیں ہوشیار رہنا چاہئے کہ کہیں وہ ان کو اور ان کی بیوی کو دھوکے میں نہ ڈال دے اور وہ جنت اور اس کی نعمتوں سے محروم نہ ہو جائیں۔ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ حضرت آدمؑ کو جس درخت کے قریب جانے سے منع کیا گیا تھا، اس کے بارے میں شیطان نے انھیں بتایا کہ اس درخت میں کوئی خرابی نہیں ہے اس سے تو انسان کو حیات جاودانی اور عیشِ دوام ملتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ نے اس سے منع بھی کیا ہے۔

حضرت آدمؑ اس کے دھوکے میں آگئے۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ اس کے نتیجہ میں جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیئے گئے۔ یہ واقعہ جس طرح بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خطاب بھی اصلاً حضرت آدمؑ ہی سے تھا۔ اور شیطان نے بھی اصلاً حضرت آدم ہی کو ورغلایا اور دھوکے میں ڈالا، اور انھوں نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے فوراً توبہ کی۔

حضرت آدمؑ سے جو غلطی ہوئی تھی اس میں بلا شبہ حضرتِ حوّا بھی شریک تھیں اور توبہ بھی انھوں نے کی لیکن قرآن مجید نے حضرت آدمؑ کی غلطی اور توبہ کا تو مستقل ذکر کیا ہے لیکن حضرت حوّا کی غلطی کا اس نے الگ سے ذکر تک نہیں کیا ہے۔ باقی رہا ان کا حضرت آدمؑ کو گمراہ کرنا تو ان کا ذکر کرنا کیا معنی اس کی طرف قرآن نے کوئی اشارہ تک نہیں کیا ہے۔

تحقیق و تنقید

تاریخ اسلام میں فنِ شانِ نزول کی اہمیت ۔ ایک تنقیدی نظر

ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی

قرآن فہمی میں فنِ شانِ نزول کی اہمیت و مناسبت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس کی مدد سے بسا اوقات نزولِ قرآنِ کریم کا تاریخی پس منظر ہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ آیات کریمہ کے معاشرتی سیاق و سباق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ علوم قرآنیہ کے ماہرین علماء نے اس پر متعدد فنی کتابیں لکھی ہیں[1]، محدثین کرام نے اپنی کتب احادیث نبوی میں اس پر مستقل باب باندھے ہیں[2]، مورخین نے واقعات کے بیان میں اس کے حوالے دیئے ہیں[3] اور مفسرین عظام نے تو تقریباً بلا استثنار اس فن سے برابر استفادہ کیا ہے[4]۔ سردست ہمارا موضوع نہ تو شانِ نزول کے فن پر مفصل بحث ہے اور نہ ہی ان تمام آیات کریمہ کا تجزیہ و تحلیل پیش نظر ہے جن کے بارے میں شانِ نزول کا ذکر ملتا ہے۔ اس مضمون میں ایک بنیادی نکتے سے بحث کی جائے گی کہ تاریخ اسلام کے سمجھنے میں اس فن سے کیا مدد مل سکتی ہے اور کس حد تک اس فن کو تاریخ سے

---

[1] ملاحظہ کیجئے: واحدی، اسباب النزول، مصر ۱۳۱۵ھ، سیوطی، لباب النقول فی اسباب النزول، مصر ۱۹۵۴ء، سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، اردو ترجمہ، نور محمد کارخانہ تجارت کراچی (غیر مورخہ)، باب نہم، ص ۸۵-۶۸۔ [2] بخاری، الجامع الصحیح، باب تفسیر القرآن، نیز مالک بن انس، الموطا، امام مسلم بن حجاج الجامع الصحیح، ترمذی کی جامع کے تفسیر قرآن پر ابواب۔ [3] ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد ابن قتیبہ ابن اعثم کوفی، بلاذری، یعقوبی، طبری، ابن عبد البر، ابن خلدون اور ابن حجر جیسے متعدد مورخین و سیرت نگاروں کی تصانیف جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ [4] مفسرین کرام اور ان کی تصانیف پر مکمل بحث آرہی ہے۔

مناسبت ہے۔ اور یہ محدود مطالعہ بایں طور اور بھی محدود ہو جاتا ہے کہ ہماری ساری توجہ سر دست صرف ایک واقعہ پر مرکوز رہے گی اور وہ ہے صدقات بنی مصطلق پر حضرت ولید بن عقبہ اموی کی بطور مصدّق (محصل صدقات) تقرری، ان کا عمل اور اس کے ذیل میں سورۂ حجرات کی آیت نبا کی شانِ نزول[1]۔

چونکہ فنِ شانِ نزول کی ساری عمارت روایت کی بنیادوں پر قائم ہے اس لئے زیر بحث مسئلہ میں تاریخی، تفسیری اور حدیثی روایات میں حد فاصل نہیں کھینچی جا سکتی۔ مزید برآں چوں کہ اس واقعہ کا ایک انتہائی، ہیجان آفریں اور اختلافی تاریخی پہلو ہے اس لئے بحث میں تاریخ و تفسیر و حدیث کا ایک حسین و دل چسپ امتزاج از خود ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کہیں اور عرض کر چکا ہوں[2] کہ یہ واقعہ بجائے خود اتنا عجیب ہنگامہ خیز اور اختلافی نہ تھا کم از کم عہدِ نبوی یا عہد صحابہ میں ــ کہ اس پر مستقل دفتر لکھے جاتے اور روایات کا ایک مجموعہ جمع کر دیا جاتا مگر ہمارے عباسی دور کے مورخین و مصنفین، محدثین و مفسرین، سوانح نگار و تذکرہ نگار حضرات نے اس واقعہ اور اس کے متعلقات پر ضرورت سے زیادہ توجہ دے کر اس کو انتہائی بدنما مسئلہ بنا دیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ تذکرہ نگاران عہدِ عباسی نے حضرت ولید بن عقبہ اموی کی حیات پر بالخصوص عہد نبوی میں ان کی سرگذشت کے کسی پہلو پر سرے سے توجہ ہی نہ دی۔ صرف اسی واقعہ صدقات بنی مصطلق پر اپنے قلم و فن کا سارا زور صرف کر دیا، اتنا کہ عہد عثمانی میں ان کے بعض طرز عمل پر جب یہ مصنفین و مورخین گرفت کرتے ہیں تو اس بینہ طرز عمل کا سرا عہد نبوی کے واقعہ سے جوڑ دیتے ہیں اور بعد میں رونما ہونے والے واقعہ کی دلیل اور ثبوت پندرہ بیس سال پہلے واقع

---

[1] آیت کریمہ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ۔ (اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس ایک گنہگار خبر لے کر آئے تو تحقیق کرو، کہیں جا پڑو کسی قوم پر نادانی سے، پھر کل کو لگو اپنے کئے پر پچھتانے" ــ ترجمہ شاہ عبد القادر دہلوی) [2] خاکسار کی آنے والی کتاب حیات ولید بن عقبہ اموی ــ ایک تنقیدی مطالعہ (زیر طبع)

ہونے والے حادثے سے ملاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس واقعہ کی وہ شہرت ہوئی کہ بعض بڑے بڑے مفسرین و مورخین اپنے کو تر دامنی سے نہ بچا سکے۔ اس واقعہ کی ہمہ گیر شہرت بلکہ خیرہ کن دہشت کا عالم یہ ہے کہ بعد کے ہر دور میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور جب کوئی مفسر و مورخ اس پر قلم اٹھاتا ہے تو بلا تنقید و تحقیق اور بغیر تفحص و جستجو کے پورا واقعہ ہی نہیں بلکہ صاحبِ معاملہ کی صحابیت کے شرف اور اعلیٰ مقام کو بھول جاتا ہے حتیٰ کہ وہ ان کے مقابلے میں اپنی فروتری اور پستی کی بھی رعایت نہیں کرتا۔ الا ما شاء اللہ۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے متعلق تمام تاریخی، تفسیری اور حدیثی معلومات و روایات کا تجزیہ و تحلیل کر کے اصل واقعہ کو اجاگر کیا جائے تاکہ ایک طرف تو یہ معلوم ہو سکے کہ حقیقت کیا تھی اور دوسری طرف یہ طے کیا جا سکے کہ تاریخ اسلام کے مطالعے اور فہم میں شان نزول کے فن پر کس حد تک اعتماد کرنا چاہیے۔ ترتیب زمانی اور تاریخ کے تقاضے کے مطابق اس بحث کا آغاز تاریخی واقعات کے تجزیے سے کیا جاتا ہے۔

(الف)

تاریخی واقعات و روایات

سیرتِ نبوی کی اولین دستیاب کتاب سیرۃ رسول اللہ، جو ابن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ/۷۶۸ء) کی تصنیف اور اس کے مرتب و محافظ ابن ہشام (متوفی ۲۱۳ھ/۸۲۸ء) کی موجودہ کتاب السیرۃ النبویۃ کی دین ہے، کے مطابق یہ واقعہ یزید بن رومان کی سند پر بیان ہوا ہے جو آل زبیر کے ایک مولیٰ (آزاد کردہ غلام، یا رشتۂ "ولا" قائم کرنے والے آزاد شخص) تھے۔ ان کی روایت ہے کہ بنو مصطلق کے اسلام لانے کے دو سال بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ اموی کو ان پر عاملِ صدقات بنا کر بھیجا۔ قبیلے والوں نے ان کی آمد کی خبر سن کر ان کی پذیرائی کے لئے سوار ہو کر اپنے علاقے سے کچھ قدم ان کی جانب بڑھ آئے۔ حضرت ولید ان کے اس طرح نکلنے پر خوفزدہ ہو گئے اور واپس جا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ بنو مصطلق نے نہ صرف صدقات روک لئے بلکہ ان کے قتل کے درپے ہو گئے۔ مسلمان یہ سن کر بنو مصطلق کے

خلاف لشکر کشی کی باتیں کرنے لگے، اتنی کثرت سے کہ آپؐ بھی ان کے ہم نوا ہونے لگے۔ مدینہ میں یہ صورت حال تھی کہ بنو مصطلق کا ایک وفد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا اور انھوں نے بیان کیا کہ کس طرح عامل نبوی ان کے علاقے میں آئے اور پھر ان کا استقبال کنندوں کو دیکھ کر کس تیزی سے بلا کچھ کہے سنے واپس لوٹ گئے۔ وفد کے اراکین نے پھر حضرت ولید کے مبینہ الزامات کی تردید کی اور تب یہ آیت نازل ہوئی ؎

واقدی (متوفی ۲۰۷ھ/۸۲۲ء) نے اگرچہ اپنی روایت بلا سند بیان کی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنو مصطلق کے وفد کے بعض اراکین کے بیان پر مشتمل ہے۔ واقدی کی روایت میں بعض اہم جزئیات ہیں مثلاً یہ کہ بنو مصطلق نے اپنی زمینوں اور باڑوں میں مسجدیں تعمیر کر لی تھیں۔ انھوں نے جب حضرت ولید کے آنے کی خبر سنی تو ان کے بیس افراد جزر (دودھاری اونٹنی) اور نَعَم (دودھار بکری بھیڑ وغیرہ) یعنی صدقات کے جانور لے کر ان کے استقبال کو آگے بڑھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی مصدق یا عامل بعیر (باربرداری کا اونٹ) اور شاۃ (عام بھیڑ بکری) صدقے میں نہیں قبول کرتا ہے۔ دوسری طرف عامل صدقات نے ان کو دور سے دیکھا تو وہ تیزی سے لوٹ گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ بنو مصطلق کے لوگ ان کے پہونچنے پر مسلح تھے۔ اور ان کے اور صدقہ کے درمیان حائل ہو گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف ایک تعزیری فوج بھیجنے کا ارادہ فرمایا تھا کہ بنو مصطلق والوں کو اس کی سن گن مل گئی اور ان کا ایک وفد جو استقبال کنندوں پر مشتمل تھا مدینہ پہونچا اور انھوں نے بارگاہِ رسالت میں ان کے آنے، دور سے لوٹ جانے، اپنے استقبال کے لئے نکلنے وغیرہ کا ذکر کر کے عرض کیا کہ حضرت ولید سے پوچھیے کہ کیا انھوں نے ہم سے اس سلسلے میں کوئی بات بھی کی تھی۔ قبیلہ کے اراکینِ وفد کا بیان ہے کہ ہم جناب نبوی میں اپنا عذر بیان کر ہی

؎ ابن اسحاق، سیرۃ رسول اللہ، انگریزی ترجمہ الفرید گلیوم (A-GUILLAUME) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن ۱۹۵۵ء، ص ۴۹۳۔

رہے تھے کہ آیت کا نزول شروع ہوا۔ وحی کے ختم ہونے کے بعد آپ نے قرآن کا وہ حصہ سنایا اور ہمارے عذر اور ہمارے "صاحب" کے بارے میں آیت کریمہ کے نازل ہونے سے باخبر کیا۔[۵۸]

ابن سعد، کاتب و شاگردِ واقدی، نے اپنے استاد و پیش رو کی روایت کو مختصراً بیان کر دیا ہے اس میں اگرچہ کچھ فرق ہے تو صدقات کے مویشیوں کا فرق بتانے والا جملہ نہیں ہے۔[۵۹] ابن قتیبہ نے نہ صرف یہ کہ اس واقعہ کو اور اس کے ذیل میں مذکورہ بالا آیت کریمہ کے نزول کو بیان کیا ہے بلکہ حضرت ولید کو صاف صاف "کاذب" (جھوٹا) کہا ہے اگرچہ ان کو فاسق نہیں قرار دیا ہے۔ پھر اپنے دعوے کی مزید تائید اس روایت سے کی ہے جس میں سورہ سجدہ کی آیت نمبر۱۸[۶۰] کا حضرت علی اور حضرت ولید کے درمیان ایک نزاع پر نازل ہونے کا ذکر ہے۔[۶۱] ابن اعثم کوفی نے سورہ سجدہ کی آیت کا سبب نزول بیان کرنے کے بعد بنو مصطلق کا واقعہ بیان کیا ہے اور اس کی تائید میں حضرت حسان بن ثابت، شاعر نبوی، کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے۔[۶۲] ابوالفرج اصفہانی نے ابن قتیبہ کے انداز میں واقعۂ بنی مصطلق کو بیان کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ آیت کریمہ حضرت ولید کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔ اصفہانی نے اس سے خود نتیجہ اخذ کر کے حضرت ولید کو فاسق

---

[۵۸] واقدی، کتاب المغازی، مرتبہ مارسدن جونس (MARSDEN JONES)، آکسفورڈ ۱۹۶۶ء، ص ۸۱-۹۸۔ [۵۹] ابن سعد، الطبقات الکبری، دار صادر بیروت ۱۹۵۷ء، دوم ص ۱۶۱۔ [۶۰] آیت کریمہ ہے: أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ۔ (کیا ایک جو ہے ایمان پر برابر اس کے جو بے حکم ہے، نہیں برابر ہوتے۔ ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی) [۶۱] ابن قتیبہ، المعارف، مرتبہ ثروت عکاشہ، قاہرہ ۱۹۶۰ء، ص ۳۱۸-۳۱۹۔

[۶۲] ابن اعثم کوفی، کتاب الفتوح، حیدرآباد دکن ۱۹۶۸ء، جلد دوم ص ۲۵۹-۶۰۔

بھی کہا ہے اور زانی بھی۔ آخر الزام لگانے کا شرف تنِ تنہا اصفہانی کو جاتا ہے[۱۱۳]۔ بلاذری نے اپنی انساب الاشراف کی جلد اول میں جو عہد نبوی سے متعلق ہے نہ تو واقعۂ بنی مصطلق کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی ان دونوں آیات کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔ البتہ اپنی پانچویں جلد میں واقعہ بنی مصطلق کو مختصراً بیان کر کے سورہ حجرات کی آیت کریمہ کے بارے میں وہی شان نزول بیان کی ہے جو دوسرے مذکورہ بالا مورخین نے کی ہے[۱۱۴] مورخ طبری نے بھی اپنی تاریخ میں نہ تو اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی آیت کریمہ متعلقہ کے سبب و شانِ نزول کا[۱۱۵] ان کے علاوہ مصعب زبیری[۱۱۶] اور محمد بن حبیب بغدادی ایسے علماء تاریخ و انساب میں ہیں جنھوں نے اس واقعہ کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ موخر الذکر نے تو اپنی فہرست "امراء رسول اللہ" میں حضرت ولید کو بنو مصطلق کا عاملِ صدقات ہی نہیں بتایا ہے[۱۱۷]۔

دوسرے مورخین اور تذکرہ نگار، جنھوں نے حضرت ولید بن عقبہ کی صدقات بنی مصطلق پر تقرری کے واقعہ کو بیان کیا ہے اور اس کے ضمن میں سورہ حجرات کی آیت

---

[۱۱۳] ابوالفرج اصفہانی، کتاب الاغانی، بیروت ۱۹۵۵ء، چہارم ص ۳۴۳ اور ص ۳۵۶-۳۵۷۔

[۱۱۴] بلاذری، انساب الاشراف، مرتبہ محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء، اول ص ۵۳۰، بلاذری نے بنو مصطلق کے دوسرے عامل حضرت عباد بن بشر انصاری کا تو ذکر کیا ہے جو حضرت ولید بن عقبہ کے جانشین ہوئے تھے لیکن اس موقعہ پر اس نے حضرت ولید کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ حضرت ولید کے واقعہ کے لئے ملاحظہ ہو: جلد پنجم (یروشلم ۱۹۳۶ء) ص ۳۵۔

[۱۱۵] طبری، تاریخ طبری، مرتبہ محمد ابوالفضل ابراہیم، دارالمعارف مصر ۱۹۶۲ء، دوم ص ۵۹۴، ص ۶۰۴، ص ۶۰۹-۶۱۰ اور جلد سوم ص ۱۴۷ اور ص ۱۵۳۔ طبری نے اس واقعہ کو بنو مصطلق یا مریسیع کے ذیل میں ذکر کیا ہے جیسا کہ عام مورخین کا قاعدہ ہے اور نہ ہے امراء رسول اللہ کے ذیل میں۔

[۱۱۶] مصعب زبیری، کتاب نسب قریش، مرتبہ لیفی پروفنسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۱۳۸۔

[۱۱۷] محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء، ص ۱۲۶۔

قرآنیہ کی شانِ نزول بیان کی ہے اور حضرت ولید کو صراحتاً یا ضمناً فسق کا مجرم قرار دیا ہے، یعقوبی[۱۸]، ابن عبدالبر[۱۹]، ابن حزم[۲۰]، ابن حجر[۲۱]، ابن اثیر[۲۲] اور ابن خلدون[۲۳] ہیں۔ متاخرین میں ذہبی اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ وہ صدقات بنی مصطلق کا عامل تو حضرت ولید کو بتاتے ہیں تاہم سورہ حجرات کی متعلقہ آیت کا کوئی حوالہ نہیں دیتے بلکہ سورہ سجدہ کی آیت کریمہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ اس آیت کی شان نزول کے بارے میں مذکورہ روایت کی سند صحیح ہے تاہم اس آیت کا مصداق عام جہنمی ہیں، کوئی مخصوص شخص نہیں[۲۴]۔ بعد کے مورخین اور مصنفین نے بلا تحقیق و تنقید اس واقعہ کو مع آیت کریمہ کے شان نزول کے قبول کر لیا ہے اور ان میں ہمارے دور کے ممتاز عالم دین مولانا مودودی کافی نمایاں نظر آتے ہیں[۲۵]۔

(ب)

تفسیری روایات و آثار

تقریباً تمام مفسرین نے اپنی تفاسیر میں سورۂ حجرات کی متعلقہ آیت کریمہ کی شان نزول اور اطلاقِ معنی سے بحث کی ہے۔ اور یہی حال، لیکن کسی کم درجہ میں، محدثین کرام کی جلیل القدر تصانیف میں ملتا ہے۔ محدث و تذکرہ نگار ابن عبدالبر نے نہ صرف یہ کہ حجرات کی آیت کا مذکورہ بالا سبب نزول بیان کیا ہے بلکہ یہ فتویٰ بھی دیا ہے کہ علماء کے درمیان اس باب میں

---

۱۸ یعقوبی، تاریخ الیعقوبی، بیروت ۱۹۶۰ء، دوم ص ۵۰۔ ۱۹ ابن عبدالبر، الاستیعاب، برحاشیہ اصابہ سوم ص ۵۹۴ - ۹۶۔ ۲۰ ابن حزم، جوامع السیرۃ، دار المعارف مصر (غیر مورخہ)، ص ۲۰۵۔ ۲۱ ابن حجر، الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ، مصر ۱۹۳۹ء جلد سوم ص ۵۹۴ - ۵ - نیز تہذیب التہذیب، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۷ھ، جلد ۱۱ ص ۱۴۴ - ۱۴۲۔ ۲۲ ابن اثیر، اسد الغابہ، تہران ایڈیشن ۱۳۷۷ھ، پنجم ص ۹۱ - ۹۰۔

۲۳ ابن خلدون، تاریخ، ، اول ص ۹۴ - ۸۳۔

۲۴ ذہبی، سیر اعلام النبلاء - قاہرہ ۱۹۶۲ء سوم ۶ - ۲۷۵ -

۲۵ سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، دہلی ۱۹۷۹ء، ص ۱۲ - ۱۱۱، نیز حاشیہ ص ۸ -

کوئی اختلاف نہیں ہے[۲۵] یہ کہنے کی بات نہیں ہے کہ حافظ ابن عبد البر نے اپنے علم و فہم کے مطابق یہ عام فیصلہ صادر فرمادیا تھا جو ان کے علم و یقین کی حد تک صحیح بھی ہو سکتا ہے لیکن بعد کے ادوار پر اس کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس سے سند حاصل کی جا سکتی ہے[۲۶]۔ چونکہ محدثین کرام کی روایات تفسیری روایات کی بنیاد و ماخذ ہیں اس لئے محدثین کرام کی آرا پر الگ سے بحث کی ضرورت نہیں ہے اور وہ تفسیری روایات کے ضمن میں از خود زیر بحث آجائیں گی۔

ہم تک جن مفسرین کی تفاسیر پہونچی ہیں اور جنھوں نے اس موضوع پر کلام کیا ہے ان کے تنقیدی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تین طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے طبقہ میں وہ تمام مفسرین کرام آتے ہیں جنھوں نے آیت کریمہ میں مستعمل لفظ "فاسق" کا اطلاق حضرت ولید بن عقبہ اموی پر اور لفظ "نبأ" کا ان کی بارگاہ نبوی میں روداد و خبر دینے پر کیا ہے۔ اس طرح یہ طبقہ مفسرین حضرت ولید کو علانیہ اور صریح الفاظ میں فسق کا مجرم و مرتکب گردانتا ہے۔ دوسرے طبقۂ مفسرین میں وہ علماء آتے ہیں جو آیت کریمہ کے نزول کا سبب واقعہ بنی مصطلق کو قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان دونوں الفاظ کے معنی میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ جیسے کہ ذہبی نے سورہ سجدہ کی آیت کریمہ کے ذیل میں تشریح کی ہے۔ یعنی اس طبقہ کے مفسرین ایک روایت میں تو حضرت ولید کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں مگر دوسری روایت میں عام فاسق اس سے مراد لیتے ہیں۔ تیسرا طبقہ ان مفسرین قدیم و جدید پر مشتمل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ واقعہ بنی مصطلق آیت کریمہ کے نزول کا زمانہ اور وقت رہا ہو تاہم وہ حضرت

---

[۲۵] موصوف کی عبارت ہے: ولا خلاف بین اھل العلم بتاویل القرآن فیما علمت ان قولہ عزوجل "اِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا" فی الولید بن عقبۃ۔ ملاحظہ کیجئے استیعاب جلد دوم ص ۶۰۳۔ [۲۶] مولانا مودودی مرحوم و مغفور نے اس سے سند حاصل کی ہے ملاحظہ ہو، خلافت و ملوکیت ص ۱۱۳ بالخصوص حاشیہ۔

ولید بن عقبہ پر لفظ فاسق کا اطلاق نہیں کرتے۔

طبقۂ اول مفسرین صدقاتِ بنی مصطلق پر حضرت ولید بن عقبہ کی تقرری، ان کے طرزِ عمل، بارگاہِ رسالت میں ان کی روداد، وفدِ بنی مصطلق کی آمد اور ان کی معروضات اور آیتِ کریمہ کے نزول کے تمام مسائل کو مختلف اسناد کی بنیاد پر بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ ان روایتوں میں کافی تفصیلات کا فرق ہے تاہم وہ اپنے مقصد و تجزیے میں متحد ہیں۔ طبری نے یہ روایت چھ مختلف اسناد سے بیان کی ہے۔ جن میں ایک حضرت ابن عباس سے، ایک مجاہد سے اور دو دو روایتیں قتادہ اور ابن ابی لیلیٰ کی اسناد پر مروی ہیں[۵۲۸]۔ فی شانِ نزول کے امام واحدی نے صرف حضرت حارث بن ضرار خزاعی کی تنہا سند پر یہی سببِ نزول بیان کیا ہے[۵۲۹]۔ ابن تیمیہ[۵۳۰] اور ان کے شاگرد رشید ابن قیم[۵۳۱] کا بھی یہی خیال ہے کہ حضرت ولید ہی اس آیت کے نزول کا سبب تھے اور وہی اس کے مصداق بھی۔ مفسر ابن کثیر نے اس مضمون کو کئی اسناد پر بیان کیا ہے جن میں بعض ابن جریر طبری سے، بعض مسند احمد بن حنبل کی سند پر، بعض ابن ابی حاتم اور طبرانی سے اور دو روایتیں مجاہد اور قتادہ سے بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ان روایات میں صحیح ترین حضرت حارث بن ابی ضرار خزاعی کی سند پر بیان ہونے والی روایت ہے[۵۳۲]۔ بدر الدین زرکشی نے فاسق سے مراد حضرت ولید کو لیا ہے[۵۳۳]۔ محمد بن احمد بن جزی کلبی نے بھی حضرت ولید پر فسق کا کھلا

---

۵۲۸ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، مطبعہ میمنیہ مصر (غیر مورخہ)، جلد ۲۷، ص ۷۲-۷۱۔

۵۲۹ واحدی، اسباب النزول، ص ۲۹۲-۲۹۱۔ ۵۳۰ ابن تیمیہ، منہاج السنۃ النبویہ، مطبعہ امیریہ مصر ۱۳۲۲ھ، سوم ص ۱۷۶۔ ۵۳۱ ابن قیم، التفسیر القیم، مرتبہ محمد اویس ندوی، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ ۱۹۴۹ء، ص ۴۴۱۔ ۵۳۲ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، عیسیٰ البابی مصر (غیر مورخہ)، چہارم ص ۲۰۸-۲۰۱ نیز اردو ترجمہ نور محمد کارخانہ تجارت کراچی (غیر مورخہ) پارہ ۲۶، ص ۴۷-۴۸۔ ۵۳۳ بدر الدین محمد بن عبد اللہ زرکشی، البرہان فی علوم القرآن، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم، عیسیٰ البابی مصر ۱۹۵۷ء، جز اول ص ۱۶۰۔

الزام ہی نہیں لگایا بلکہ ان کی پوری حیات کو فاسقانہ قرار دیا ہے۔[۳۳۴]

جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) کو طبقۂ اول کے مفسرین کا نمائندہ سمجھنا چاہیے کیونکہ انھوں نے غالباً قدیم و متوسط تمام علماء تفسیر میں۔ بلکہ جدید مفسرین میں بھی۔ ان سے بڑھ کر اور کسی نے تحقیق و تفحص سے کام نہیں لیا ہے۔ موصوف نے تقریباً دس مختلف سندوں کے ساتھ جو روایت بیان کی ہے وہ طبقۂ اول کے مفسرین کے نظریے کی تائید کرتی ہے اگرچہ ان کی گیارہویں روایت طبقۂ دوم کے مفسرین کے خیال کی موافقت میں ہے۔ ان کی پہلی سند احمد بن حنبل، طبرانی، ابن ابی حاتم، ابن مندہ کی "سندِ جید" پر حضرت حارث بن ضرار خزاعی سے، دوسری طبرانی، ابن مندہ اور ابن مردویہ کی علقمہ بن ناجیہ خزاعی سے، تیسری اوسط میں بیان کردہ طبرانی کی حضرت جابر بن عبد اللہ سے، چوتھی سند ابن راہویہ، ابن جریر، طبرانی اور ابن مردویہ کی حضرت ام سلمہ ام المومنین سے، پانچویں ابن جریر، ابن مردویہ، اور بیہقی نے اپنی اپنی سنن اور ابن عساکر نے اپنی تہذیب میں حضرت ابن عباس سے، چھٹی سند آدم، عبد بن حمید، ابن المنذر اور بیہقی کی مجاہد سے، ساتویں ابن مردویہ کی حضرت جابر بن عبد اللہ سے، آٹھویں سند میں عبد بن حمید کی حسن سے، نویں میں انھیں بزرگ کی عکرمہ سے اور دسویں سند میں عبد بن حمید اور ابن جریر کی قتادہ سے اس آیت کریمہ کا حضرت ولید بن عقبہ کے شان میں نازل ہونا بتایا ہے۔[۳۳۵] سیوطی نے اپنی دوسری کتاب میں جو فنِ شانِ نزول پر ہے انھیں سندوں کی بنیاد پر انھیں روایات کو اجمالاً بیان کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ ان کی تمام اسناد کے سارے راوی ثقہ اور معتبر ہیں۔[۳۳۶] اسی

---

[۳۳۴] محمد بن احمد بن جزی کلبی، کتاب التسہیل لعلوم التنزیل، مطبعہ مصطفیٰ محمد مصر ۱۳۵۵ھ، جلد چہارم ص ۵۹ - ۵۸۔

[۳۳۵] سیوطی، الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، مکتبہ اسلامیہ تہران (غیر مورخہ) جلد ششم ص ۸۹-۸۷۔

[۳۳۶] سیوطی، لباب النقول فی اسباب النزول، مصر ۱۹۵۴ء، ص ۲۰۲-۲۰۱

طبقۂ اول میں بغوی[۳۳۷]، ابن العربی[۳۳۸]، ابوالفیض فیضی[۳۳۹]، اور ہمارے دوسرے مفسرین جیسے معین الدین بن صفی الدین[۳۴۰]، محمد بن علی شوکانی[۳۴۱]، اور محمد نووی جاوی[۳۴۲] بھی آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بیشتر شیعہ مفسرین جیسے ہاشم بن سلیمان بحرانی[۳۴۳]،

---

۳۳۷ ابومحمد حسین الفراء بغوی، معالم التنزیل، مطبع حیدری بمبئی ۱۲۹۵ھ، ص ۸۳۸۔
۳۳۸ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی، احکام القرآن، تحقیق علی محمد البجاوی، عیسیٰ البابی مصر ۱۹۶۸ء جلد چہارم ص ۴-۱۷۰۳۔ ۳۳۹ ابوالفیض فیضی، سواطع الالہام، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۸۹ء ص ۶-۱۴۴۔ فیضی نے اپنی خود عائد کردہ پابندی کے سبب حضرت ولید بن عقبہ کا نام لینے سے گریز کیا ہے اور واقعہ کا مختصراً اشارہ کنایہ میں بیان کیا ہے تاہم اس کی بھی مراد وہی ہے جو عام طور سے اس طبقہ کی ہے۔ ۳۴۰ معین الدین بن شیخ صفی الدین، جامع البیان فی تفسیر القرآن، مطبع فاروقی دہلی (غیر مورخہ) جلد دوم ص ۴۱-۰۴۴۔ ۳۴۱ محمد بن علی شوکانی، فتح القدیر، مطبعہ مصطفی البابی مصر ۱۹۶۵ء، جلد پنجم ص ۷۲۔ شوکانی کا بیان ہے کہ اگرچہ قصے [illegible] تاہم روایات کثیرہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ولید ہی اس کا سبب نزول تھے [illegible] سے مراد ہیں۔ ۳۴۲ محمد نووی جاوی، مراح لبید۔ تفسیر النووی، عیسیٰ البابی مصر (غیر مورخہ) جلد دوم ص ۳۱۳۔ حاشیہ پر ابوالحسن علی بن احمد واحدی (متوفی ۴۶۸ھ) کی کتاب الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز ہے اور وہ بھی اس نوع کی رائے کا اظہار کرتی ہے۔ ۳۴۳ ہاشم [illegible] سلیمان بحرانی (متوفی ۱۱۰۷ھ یا ۱۱۰۹ھ)، البرہان فی تفسیر القرآن، تہران ۱۳۷۵ھ چہارم ص ۲۰۵-۶۔ بحرانی نے اس سلسلہ میں سات روایتیں بیان کی ہیں۔ پہلی روایت میں فسق کے معنی کذب (جھوٹ) بتلاتے ہیں۔ چار روایات میں مختلف اسناد سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے الزام لگایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیم آپ کے نہیں بلکہ جریح قبطی کے ہیں۔ آپ نے غضب ناک ہو کر قبطی کے قتل کے لئے حضرت علی کو مامور کر دیا مگر قبطی نے ثابت کر دیا کہ وہ مجبوب ہے اور تناسل کے ناقابل۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ چھٹی روایت میں اس آیت کا اور ساتویں میں سورہ سجدہ کی آیت کا شان نزول حضرت ولید کے واقعات کو بیان کیا ہے۔

ابوالحسن عاملی اصفہانی، وغیرہ بھی شمار ہوتے ہیں[۱۴۴]۔ اگرچہ شیعہ مفسرین نے اپنی ایک مخصوص شیعی روایت میں اس آیت کریمہ کی شان نزول حضرت عائشہ صدیقہ کے ذیل میں بیان کی ہے۔ اور اس سے ان کے نسبتاً معتدل امامی مفسر ابوعلی فضل بن حسن طبرسی (متوفی ۵۴۸ھ) جو اپنی دوسری آراء کی بناء پر طبقہ دوم کے مفسر ہیں، اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں[۱۴۵]۔

طبقہ اول کے مفسرین کی بیان کردہ روایات اور ان کی اسناد کا ذکر کرنے کے بعد ان کا تجزیہ و تحلیل ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ بنو مصطلق کا واقعہ مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قاری کے ذہن پر ان کو پڑھنے کے بعد پہلا تاثر یا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر واقعہ کی اصل صورت کیا تھی؟ اس ذیل میں متعدد دوسرے سوالات ابھرتے ہیں:

اول یہ کہ حضرت ولید بن عقبہ نے اپنی ناکام واپسی کی کیا وجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی تھی؟

دوم یہ کہ صحابی موصوف کی روئداد سن کر مسلمانوں کا بالعموم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بالخصوص کیا ردعمل ہوا تھا؟

سوم یہ کہ بنو مصطلق کے وفد نے کیا معذرت کی تھی اور ان کی معذرت کے بعد کیا ردعمل ہوا تھا؟

۱۴۴۔ ابوالحسن عاملی اصفہانی، تفسیر المرآۃ و مشکوۃ الاسرار، تہران، (غیر مورخہ)، ص ۲۶۰۔ عاملی نے فسق کے معنی سورہ سجدہ کے ذیل میں بتائے ہیں اور اس کا سبب نزول حضرت علی و ولید کا واقعہ بتایا ہے۔

۱۴۵۔ ابوعلی فضل بن حسن طبرسی، کتاب جوامع الجامع فی تفسیر القرآن المجید، تبریز ایران ۱۳۷۹ھ، ص ۴۷۵ اور بیروت ایڈیشن ۱۹۵۵ء، جلد ۲۶، ص ۸۷۔ طبری کے ایران ایڈیشن میں شان نزول کے بارے میں دو روایتیں ملتی ہیں ایک حضرت کے بارے میں نازل ہوئی اور دوسرے "فاسق و نبأ" سے عام معنی مراد ہیں لیکن بیروت ایڈیشن میں حضرت ماریہ والدہ ماجدہ ابراہیم بن رسول کریم کا حوالہ بھی موجود ہے۔

چہارم یہ کہ خود جناب رسالتآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا!

جہاں تک پہلے سوال کا جواب ہے تو مختلف تفسیری اور تاریخی روایات حضرت ولید کی ناکام واپسی کی مختلف وجوہ بتاتی ہیں۔ بیشتر قدیم روایات اس مضمون کی ہیں کہ حضرت ولید کسی بنا پہ ڈر گئے (فَفَزِعَ) اور لوٹ کر مدینہ خبر دی کہ بنو مصطلق نے صدقات روک لیے یہ بڑی اہم بات ہے کہ تقریباً تمام ابتدائی مورخین مثلاً ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، ابن قتیبہ اور متاخرین میں ابن خلدون، ابن اثیر اور ذہبی[۱۸۸] نے ان کے خوفزدہ ہو کر راستے سے لوٹ آنے کا ذکر کیا ہے۔ بعض مورخین کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو اپنے قتل کا خوف اور صدقات نہ ادا کرنے کی غلط فہمی اس بنا پر ہوئی کہ بنو مصطلق کے استقبال کنندوں کو وہ غارت گر سمجھتے تھے۔ اس کی تائید بعض قدیم حفاظ حدیث و مفسرین کے بیانات سے ہوتی ہے۔ مثلاً مجاہد کی روایت میں مذکور ہے کہ حضرت ولید نے اپنی واپسی کا سبب اپنے قتل کیے جانے کا خوف بتایا تھا۔[۱۸۹] چنانچہ دوسرے اور تیسرے طبقہ کے مفسرین کرام نے اسی کو قبول کیا ہے۔ طبقۂ اول کے مفسرین نے بالعموم قتادہ کی روایت قبول کی ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت ولید نے بنو مصطلق پر صرف صدقات روک لینے اور اپنے قتل کے منصوبے کا ہی الزام نہیں لگایا تھا بلکہ ان پر ارتداد کا الزام بھی عائد کیا تھا۔[۱۹۰] ظاہر ہے کہ یہ دوسرا الزام زیادہ سنگین تھا اور اس میں بدنیتی اور خبث خلق کی بو آتی ہے اور وہ سراسر ارادی اور کذب کی پیداوار معلوم ہوتا ہے چنانچہ طبقۂ اول کے مفسرین نے اس کو خوب خوب قبول کیا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ سنگین الزام مفسرین کی ان روایات میں لگایا گیا ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت ولید بن عقبہ اموی اور بنو مصطلق کے درمیان جاہلیت کے زمانے سے عداوت چلی آرہی تھی اس لئے وہ عمداً راستے سے پلٹ پڑے اور بنو مصطلق پر صدقات روکنے، مرتد ہو جانے اور ان کو قتل کرنے کے ارادہ سے نکلنے کے خود ساختہ الزامات عائد کیے۔ طبقۂ اول کے مفسرین — قدیم و متاخر — نے اس کو ترجیح دی ہے چنانچہ طبری، ابن کثیر، سیوطی، نسفی، ابن حجر، واحدی[۱۹۱] وغیرہ نے اس

(۱۸۸ تا ۱۹۱) حوالوں کے لئے ملاحظہ کیجئے سابقہ کتابوں کے مذکورہ بالا صفحات۔

بات کو اپنی روایات میں نمایاں طور پر واضح کیا ہے۔

دوسرے سوال کہ حضرت ولید بن عقبہ کی رپورٹ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا کیا ردِ عمل ہوا تھا کے جواب میں اکثر روایات کا یہ بیان ملتا ہے کہ مسلمانوں نے بنو مصطلق پر فوج کشی کی باتیں شروع کر دی تھیں اور مسلمانوں کی کثرتِ گفتگو یا رائے عامہ سے متاثر ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں خطوط پر سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اسی دوران بنو مصطلق کو سن گن مل گئی اور انھوں نے ایک وفد فوراً روانہ کر دیا۔ جس نے اپنا موقف واضح کیا۔ تمام قدیم مورخین مثلاً ابن اسحٰق، واقدی، ابن سعد اور کسی حد تک ابن قتیبہ اور تمام اہم متاخرین مثلاً ابن خلدون اور ابن اثیر وغیرہ نے اسی روایت کو بیان کیا ہے۔[۹۵]

لیکن مفسرین کے یہاں بالعموم اور طبقہ اول کے مفسرین کے یہاں بالخصوص ایک دوسری روایت بھی ملتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ فوج کشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا بلکہ حقیقتاً ایک فوج حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں بھیج بھی دی تھی۔ اب یہاں سے اس روایت کے دو حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت خالد کی فوج (بعث) راستے ہی میں تھی کہ بنو مصطلق والے جو مصدق رسول کے آنے کے منتظر تھے اور ان کے وقت مقررہ پر نہ پہونچنے سے متفکر تھے اپنے سردار حضرت حارث بن ضرار خزاعی کی سرکردگی میں روانہ ہوئے اور راستے میں اس لشکر نبوی سے ملے اور سارا ماجرا کہہ کر اپنا موقف واضح کیا اور پھر وہ مدینہ بھی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ساتھ اپنی قوم کے صدقات بھی لے گئے تھے۔ لیکن بعض دوسری روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت خالد بن ولید کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ رات میں سفر کر کے صبح سویرے بنو مصطلق کے علاقے میں پہونچیں اور حملہ کرنے سے پہلے معلوم و جستجو کر لیں کہ بنو مصطلق کا اسلام کے بارے میں کیا طرزِ عمل ہے۔ حسبِ ہدایتِ نبوی حضرت خالد بن ولید نے کوچ کیا اور علاقے میں پہونچنے کے بعد انھوں نے اذان و نماز کی صدائیں سنیں اور واپس آکر بنو مصطلق کے اسلام کی تصدیق کی۔[۹۶] گویا کہ حضرت خالد بن ولید کی یہ فوج دراصل غارتگر نہ تھی بلکہ طلیعہ تھی جو صرف خبر لانے اور مصدق رسول کی تصدیق کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی۔

تیسرے سوال کہ بنو مصطلق کے وفد نے کیا کہا اور اس کے بعد کیا واقعہ پیش آیا کا جواب بھی مختلف روایات میں مختلف انداز سے بیان ہوا ہے۔ زیادہ تر روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بنو مصطلق نے بارگاہِ نبوی میں یہ عذر پیش کیا کہ مصدق نبوی یعنی حضرت خالد بن عقبہ اموی ان کے پاس پہونچے ہی نہیں۔ چنانچہ حضرت حارث بن ابی ضرار خزاعی کی سند پر مروی روایت میں یہی ہے جو کہ مفسرین کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح روایت ہے۔ بنو مصطلق کے سردار کا دعویٰ یہ تھا کہ ان کے اسلام لانے کے بعد آنحضرت نے ایک وقت مقررہ پر اپنا عامل صدقات بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ وقت موعود گذر گیا تو ان کو تشویش ہوئی کہ کہیں جناب رسالتمآب کسی سبب سے ناراض تو نہیں کہ مصدق نہیں بھیجا۔ چنانچہ انھوں نے تفتیشِ حال کے لئے سر برآوردہ حضرات کا ایک وفد مدینہ بھیجا جہاں ان پر یہ راز کھلا کہ حضرت ولید نے راستے سے واپس جاکر ان کے بارے میں کیا رپورٹ دی ہے۔ طبری، ابن کثیر، سیوطی اور طبقۂ اول کے تمام دوسرے مفسرین نے اسی روایت پر تکیہ کیا ہے اور محدثین کرام کے ایک بڑے طبقے نے جن میں احمد بن حنبل بھی شامل ہیں اسی روایت کو بہترین و معتمد ترین قرار دیا ہے[۵۲]۔ لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو ہم کو وہ روایات بھی نظر آتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ بنو مصطلق کے وفد کی ملاقات راستے میں حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں آنے والے لشکر سے ہوگئی تھی اور اسی سے ان پر حضرت ولید کے واپس جانے کی خبر ملی تھی۔
ان تمام روایات کے برعکس مورخین و مفسرین کی وہ روایات ہیں جن میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ وفدِ استقبالیہ نے حضرت ولید کو دور سے واپس پلٹتے دیکھ لیا تھا اور ان کے اس طرح واپس ہونے پر وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے پہونچے تھے[۵۳]۔

چوتھے سوال کہ جناب رسالتمآب نے اس پورے قضیے میں کیا فرمایا تھا کے جواب میں ہمیں بعض روایات یہ بتاتی نظر آتی ہیں کہ آپ نے ان کا عذر سن کر قبول فرما لیا اور اس کے بعد معاً آیت کریمہ نازل ہوئی لیکن بعض دوسری روایات میں ہے کہ آپ نے سکوت فرمایا اور اس کے بعد ہی فیصلہ خداوندی آیا۔ تاہم کچھ روایات ایسی بھی ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ آپ نے بنو مصطلق کے وفد کو موردِ الزام قرار دیا (فَاتَّهَمَهم) مگر پھر

ان کی معذرت قبول کرلی۔ روایات کا ایک اور مجموعہ ایسا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ آپ نے بنو مصطلق کو متہم قرار دینے کے بعد یہ بھی فرمایا تھا کہ "تم لوگ اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ میرے پاس ایک شخص میرے جیسا ہے۔ اس کو میں تمہارے خلاف بھیجونگا اور وہ تمہارے تمام جنگ کے قابل مردوں کو قتل کردے گا اور تمہاری اولاد وازواج کو غلام بنالے گا۔" یہ کہہ کے، آپ نے، اس روایت کے مطابق، حضرت علی کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا گویا کہ آپ ان کی طرف اشارہ کررہے تھے۔

مولانا صدرالدین اصلاحی

صدر ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کی بعض اہم تصانیف

۱۔ اسلام ۔ ایک نظر میں

اس کتاب میں مولانا موصوف نے اسلام کے عقائد و عبادات سے لے کر اخلاق، معاشرت اور سیاست تک تمام پہلوؤں کا جامع تعارف کرایا ہے۔ اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ اس کا انگریزی، ہندی، بنگلہ اور ملیالم زبانوں میں بھی ترجمہ شائع ہوچکا ہے

۲۔ دین کا قرآنی تصور

اس فکر انگیز کتاب میں مولانا نے ایک طرف تو اس غلط تصورِ دین کی مدلل تردید کی ہے جو مدتوں سے مسلمانوں کے اندر نفوذ کئے ہوئے ہے اور دوسری طرف قرآن کی روشنی میں دین کا صحیح تصور نکھار کر پیش کیا ہے۔ قیمت آٹھ روپے

۳۔ اساس دین کی تعمیر

تربیت کے موضوع پر یہ بہت اہم کتاب ہے۔ اس میں توحید، آخرت، نماز اور صبر پر مولانا نے بڑی عالمانہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام ان بنیادوں پر اپنے ماننے والوں کی سیرت و کردار کی تعمیر کس طرح کرتا ہے؟ قیمت بارہ روپیے۔

ملنے کا پتہ: **مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی**

"وہ نبی" جس کا انتظار تھا؟

ڈاکٹر محمد ذکی

دنیا کے تین بڑے مذاہب — یہودیت، عیسائیت اور اسلام — کی باہمی کشمکش کی داستان اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود عیسائیت اور اسلام کی تاریخ۔ اس کشمکش کے مختلف مذہبی، سیاسی اور اقتصادی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی وجہ اختلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ معرکۃ الآرا خطبہ ہے جس میں انھوں نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے نصیحت کی تھی کہ:۔

خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا (استثنا ۱۸:۱۵)

یہ پیشین گوئی توراۃ میں ہے جسے یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں آسمانی کتاب اور حضرت موسیٰؑ کو خدا کا نبی مانتے ہیں اس لئے یہ پیشین گوئی تینوں کی توجہ کا مرکز اور بحث کا موضوع بنی رہی ہے۔ ایک طرف عیسائی ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جس نبی کے ظہور کی خبر دی تھی وہ حضرت عیسیٰؑ ہی تھے جو ظاہر ہو چکے۔ اس کے برخلاف یہودی ہیں جو کہتے ہیں کہ ابھی تک وہ نبی ظاہر نہیں ہوا اور ان دونوں سے الگ اہل اسلام کا مسلک ہے جو کہتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں ہے۔

اس اختلاف کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اگر عیسائی حق پر ہیں تو یہودیت کی ساری عمارت گر جاتی ہے جس کے پیرو ابھی تک اس نبی کے منتظر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے دعوے کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔ اور اگر یہودیوں کا عقیدہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کو اس نبی کی معرفت میں دھوکا ہوا ہے۔ اور اگر اسلام کا دعویٰ صحیح ہے تو پھر عیسائیت

اور یہودیت دونوں کی بنیادیں منہدم ہو جاتی ہیں۔

یہ تو اس مسئلہ کا اختلافی پہلو تھا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر ان تینوں مذاہب کے پیرو اس نبی کی تعین پر متفق ہو جائیں تو پھر ان کے صدیوں پرانے اختلافات اور جھگڑوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور دنیا کی بیشتر آبادی ایک مرکز پر جمع ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے اس پیشین گوئی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جس پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ آئیے اس کا تحقیقی جائزہ لیں۔

اس اعلان میں دو باتیں تو بالکل واضح ہیں (۱) حضرت موسیٰؑ نے اپنے بعد ایک نبی کی بعثت کی خبر دی ہے۔ اور (۲) یہ کہ وہ نبی حضرت موسیٰؑ کی مانند ہوگا۔ البتہ دو باتیں تحقیق طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ "تیرے ہی درمیاں" سے کون لوگ مراد ہیں اور دوسری یہ کہ "تیرے ہی بھائیوں" سے کن لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

یہ الوداعی تقریر حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔ ان سے یہ خطاب دو حیثیتوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو اس حیثیت سے کہ بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھے جن کا لقب اسرائیل تھا۔ دوسرے اس حیثیت سے کہ بنی اسرائیل دنیا کی دوسری اقوام کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ حضرت یعقوبؑ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے تورات کے بیان کے مطابق (پیدائش، ب۱۲، ۱۷) خدا نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل کے حق میں خصوصی برکتوں اور نعمتوں کا وعدہ فرمایا تھا اور دنیا کی دوسری تمام اقوام پر ان کو فضیلت بخشی تھی۔

اب اگر حضرت موسیٰؑ کے ذہن میں خطاب کے وقت پہلی حیثیت تھی تو ان کے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اولادِ اسرائیل وہ نبی تم ہی لوگوں میں پیدا ہوگا۔ بالفاظ دیگر اس نبی کا تعلق بنی اسرائیل سے ہوگا۔ اور اگر ان کے ذہن میں دوسری حیثیت تھی تو مطلب یہ ہوگا کہ اے ابراہیمؑ کے خاندان والو! وہ نبی تم ہی لوگوں میں سے ہوگا یعنی خاندان ابراہیمی سے۔ لیکن ضروری نہیں کہ حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی نسل سے ہو بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے کسی دوسرے بیٹے کی نسل سے بھی ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے الفاظ میں قدرے ابہام تھا اور کئی معنی لئے جا سکتے تھے غالباً اسی کے پیش نظر مفہوم کو متعین کرنے کے لئے حضرت موسیٰؑ نے بعد کے الفاظ استعمال کئے ہیں یعنی یہ کہ وہ نبی تمہارے ہی بھائیوں میں سے ہوگا۔ اس طرح نبوت تمہارے ہی خاندان

میں رہے گی۔ اس مفہوم کی تائید خدا کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو حضرت موسیٰؑ نے آگے چل کر نقل کیا ہے کہ خدا نے فرمایا ہے:

میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ (استثناء ۱۸ : ۱۸)

دیکھئے یہاں صرف "بھائیوں" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بنی اسرائیل کی طرف مطلق کوئی اشارہ نہیں۔ نیز عہد نامہ جدید میں یہ خبر اسی انداز سے نقل کی گئی ہے:

موسیٰؑ نے کہا کہ خداوند خدا تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے مجھ سا ایک نبی برپا کرے گا (اعمال ۳ : ۲۴)

ان تشریحات کی روشنی میں حضرت موسیٰؑ کے الفاظ کا مطلب یہ ہوا کہ آئندہ زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں ایک نبی ظاہر ہوگا جو بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہوگا۔ اب رہا یہ سوال کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں سے کون لوگ مراد ہیں تو اس بارے میں بھی توراۃ کا بیان بالکل واضح ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کا سلسلہ ان کے دو بیٹوں سے چلا ہے۔ ان کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کی اولاد بنی اسماعیل اور دوسرے بیٹے حضرت اسحاق (اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب) سے جو سلسلہ چلا بنی اسرائیل کے نام سے مشہور رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کے درمیان برادرانہ تعلق رہا۔ اور توراۃ میں دونوں ہی کے حق میں خدا نے برکتوں اور نعمتوں کا وعدہ فرمایا تھا کہ ان کی نسل خوب پھیلے گی، ان میں بادشاہ اور سردار پیدا ہوں گے۔ (پیدائش ۱۲ : ۲، ۱۷ : ۲۱)

بلاشبہ یہ وعدے پورے ہوئے۔ بنی اسرائیل کو دنیا میں عروج ملا، انہیں اقوام عالم پر فضیلت بخشی گئی، ان میں بے مثل فرماں روا پیدا ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیکڑوں انبیاء ان میں ظاہر ہوتے رہے۔

لیکن کیا بنی اسماعیل کے حق میں بھی خدا کا وعدہ اسی طرح پورا ہوا؟ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں بائبل اس معاملے میں خاموش نظر آتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں تو پورا ہو، اور ان میں بے شمار انبیاء مبعوث ہوں لیکن بنی اسماعیل میں ایک نبی بھی پیدا نہ ہو اور ان کے حق میں خدا کا وعدہ پورا نہ ہو؟!!

اسی کی طرف حضرت موسیٰؑ نے اپنے طویل خطبہ میں اشارہ کیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کہ بنی اسماعیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں ان کی مانند ایک نبی پیدا ہوگا جس کی اطاعت پر بنی اسرائیل مامور ہوئے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد وہ نبی ظاہر ہوا ؟ عہدنامہ عتیق کی آخری کتاب (ملاکی) کے لکھے جانے کے وقت تک وہ نبی ظاہر نہیں ہوا تھا اور یہود کی رائے اس بارے میں معلوم و مشہور ہے کہ بقول ان کے وہ نبی ابھی تک ظاہر نہیں ہوا ہے۔ البتہ حضرت عیسیٰؑ کے متبعین نے ضرور یہ دعوی کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور دوسرے نبیوں نے جس نبی کی آمد کی خبر دی تھی وہ حضرت مسیحؑ ہی تھے جیسا کہ انجیل یوحنا میں ہے:

> فلپس نے متن ایل سے مل کر اس سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰؑ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے وہ ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔
> (یوحنا ۱:۴۵)

اسی انجیل میں آگے ہے:

> پس جو معجزہ اس نے (یعنی یسوع مسیحؑ نے) دکھایا وہ لوگ اسے دیکھ کر کہنے لگے جو نبی دنیا میں آنے والا تھا فی الحقیقت یہی ہے (۶:۱۴)

آیئے دیکھیں وہ خصوصیات جو آنے والے نبی کی بیان کی گئی ہیں حضرت مسیحؑ میں کہاں تک پائی جاتی ہیں۔

اس نبی کی پہلی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل سے ہوگا لیکن انجیل میں حضرت مسیحؑ کو اسرائیلی بتایا گیا ہے۔ انجیل متی میں حضرت مسیحؑ کا طویل شجرہ نسب دیا گیا ہے جس کی رو سے حضرت مسیح یوسف کے بیٹے تھے، جن کا نسب چالیسویں پشت میں جاکر حضرت یعقوبؑ سے مل جاتا ہے۔

اگر یہ نسب نامہ صحیح ہے تو حضرت مسیحؑ اسرائیلی ہوئے نہ کہ اسماعیلی۔ اس طرح پہلی ہی صفت ان میں موجود نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی علماء نے خود ہی یہ طے کرلیا کہ اس نبی کا تعلق بنی اسرائیل سے

ہوگا اور پھر حضرت مسیحؑ پر اس پیشین گوئی کو منطبق کرنے کے لئے یوسفؑ کے ذریعہ حضرت یعقوبؑ سے رشتہ جوڑ کر انھیں اسرائیلی ثابت کر دیا۔ لیکن یہ دعویٰ جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جبکہ جناب مسیحؑ یوسف کے بیٹے ہوں۔ اور حقیقت میں ایسا نہیں کیونکہ تمام اناجیل میں صراحت ہے کہ حضرت مسیحؑ کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے جن کو کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس صورت میں حضرت مسیحؑ یوسف کے بیٹے کس طرح ہو گئے؟ کیا اس طرح بھی باپ بیٹے کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے؟ جب کہ مسیحی علماء کے بقول یوسف کا مریم سے ازدواجی تعلق قائم نہیں ہوا تو حضرت مسیح نہ تو یوسف کے بیٹے ہوئے اور نہ اسرائیلی۔ اس اعتبار سے بھی یہ پیشین گوئی ان پر صادق نہیں آتی۔

اس کے علاوہ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ ہی الجھ جاتا ہے وہ اس طرح کہ اگر حضرت مسیحؑ کو یوسف کا بیٹا تسلیم کر لیا جائے تو پھر خدا کے بیٹے ہونے کا عقیدہ جڑ سے کٹ جاتا ہے جس کی بنیاد ہی اس پر قائم ہے کہ حضرت مسیحؑ بلا باپ کے پیدا ہوئے اسی لئے انھیں خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ اور اگر وہ خدا کے بیٹے تھے جیسا کہ عیسائی علماء کا دعویٰ ہے تو پھر یوسف کے بیٹے کس طرح ہو گئے؟!

یہی وہ تضاد ہے جس میں عیسائی علماء مبتلا نظر آتے ہیں کہ اگر وہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں تو وہ اسرائیلی نہیں ہو سکتے (کیونکہ نسب کا تعلق باپ سے ہوتا ہے) اور جب اسرائیلی نہیں ہو سکتے تو زیر بحث پیشین گوئی ان پر صادق نہیں آتی۔ اور اگر انھیں یوسف کا بیٹا بتاتے ہیں تو یہ عقیدہ ہی باطل ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کے بیٹے تھے۔

اب عیسائی علماء اس پیشین گوئی کو حضرت مسیحؑ پر منطبق کرنے سے پہلے یہ طے کریں کہ حضرت مسیحؑ یوسف کے بیٹے تھے یا خدا کے۔

آیئے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھائیں۔ دوسری نمایاں صفت اس نبی کی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی مانند ہوگا۔ حضرت موسیٰؑ کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے وقت کی سب سے بڑی جابرانہ قوت کے مقابلہ میں توحید کی دعوت دی۔ ہر طرح کی سختیوں کا مقابلہ کیا۔ بالآخر وطن کو چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے ان کا تعاقب ہوا اور پھر ان کے دشمن تباہ و برباد ہوئے۔ ان کے خلاف ہر سازش ناکام ہوئی، وہ کامیاب ہوئے اور اپنی قوم کی رہنمائی کی۔

اب دیکھئے ان میں سے کوئی بات بھی حضرت عیسیٰؑ کی سیرت میں نظر آتی ہے جس کی بنا پر

کہا جا سکے کہ حضرت مسیحؑ حضرت موسیٰؑ کی مانند تھے۔ اس کے برعکس بقول انجیل حضرت مسیح کو ان کے مخالفوں نے نہایت آسانی کے ساتھ صلیب پر چڑھا دیا۔

اس موضوع پر مزید گفتگو کی حاجت نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی سیرت توراۃ میں موجود ہے۔ حضرت مسیحؑ کے حالاتِ زندگی انجیل میں موجود ہیں۔ کیا کسی عیسائی عالم میں اتنی جرأت ہے کہ دونوں پر نظر ڈال کر یہ دعویٰ کر سکے کہ حضرت مسیحؑ حضرت موسیٰؑ کی مانند تھے؟

ان مباحث سے قطع نظر کیا عیسائی علماء نے اس پر بھی غور کیا کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک نبی کی بعثت کی خبر دی ہے نہ کہ "خدا کے بیٹے کی"۔ اگر واقعی حضرت مسیحؑ کی طرف اشارہ مقصود تھا تو اس کی بہترین صورت یہ تھی کہ ان کا تعارف ایک ایسی صفت سے کرا دیا جاتا جو سوائے ان کے آج تک کسی انسان میں نہیں پائی گئی، یعنی یہ کہ وہ بدون باپ کے پیدا ہوئے۔ پس موسیٰ علیہ السلام فرما دیتے کہ تم میں ایک نبی ظاہر ہوگا جو بغیر باپ کے وجود میں آجائے گا۔ اس طرح کسی کو بھی اشتباہ نہ ہوتا کیونکہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ سوائے حضرت مسیحؑ کے دنیا میں کوئی شخص بھی اس صفت سے موصوف و مشہور نہیں ہوا۔

اور کیا عیسائی حضرت مسیحؑ کو دوسرے تمام انبیاء کی طرح ایک نبی مانتے ہیں؟ کیا عیسائی دنیا میں حضرت مسیحؑ نبی کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے ہیں؟ (یا خدا کے بیٹے کی حیثیت سے؟)

اگر یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کو خدا کا نبی نہیں مانا تو اتنا تعجب خیز نہیں جتنا عیسائیوں کا مذکورہ بالا پیشین گوئی کا حضرت مسیح پر منطبق کرنا ہے۔ کیا یہ امر قابلِ تعجب نہیں کہ خود حضرت مسیحؑ نے بصراحت یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں وہی نبی ہوں جس کی آمد کی خبر موسیٰؑ نے دی تھی ــــــ مگر عیسائی علماء ایسا دعویٰ کرتے ہیں۔

حضرت مسیحؑ (بقول انجیل) نہ تو اسرائیلی تھے نہ اسمٰعیلی اور نہ حضرت موسیٰؑ کی مانند تھے اور نہ نبی تھے ــــــ پھر بھی تمام حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے اور نتائج سے صرفِ نظر کر کے عیسائی علماء اس پیشین گوئی کو حضرت مسیحؑ پر منطبق کر دیتے ہیں!!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت مسیحؑ وہ نبی نہیں تو ان کے علاوہ بھی کسی ہستی پر یہ پیشین گوئی منطبق ہوتی ہے؟

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد سے آج تک کسی انسان نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ موسیٰؑ نے جس نبی کی آمد کی خبر دی تھی وہ میں ہوں، سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کے ثبوت میں قرآن حکیم کی بہت سی آیات اور احادیث نقل کی جا سکتی ہیں لیکن یہاں ہم صرف ایک آیت کی نقل پر اکتفا کرتے ہیں۔ اعلان نبوت کے کچھ ہی دن بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام لوگوں کو سنایا:

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ (المزمل)

تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔

ان لوگوں کے نزدیک جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے جو بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوا اور آپ نے سنایا، لیکن جو لوگ آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے ان کے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعویٰ کیا کہ مجھ کو اسی طرح نبی بنا کر بھیجا گیا ہے جس طرح موسیٰ کو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا۔ گویا توراۃ کے الفاظ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰؑ کے مانند نبی ہیں۔ تاریخ کی روشنی میں اپنی نوعیت کا اور نہایت واضح الفاظ میں پہلا دعویٰ ہے۔

نبوت کا دعویٰ کس نے کیا ہے؟ بنی اسرائیل کے بھائیوں، یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک فرد نے۔ اس طرح اس پیشین گوئی کی تمام شرطیں پوری ہو جاتی ہیں یعنی موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے حضرت موسیٰؑ کی مانند خدا نے ایک نبی ظاہر کر دیا۔ کیا اس کے لئے مزید ثبوت اور دلیل کی ضرورت ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی سیرت بائبل میں محفوظ ہے۔ آج دنیا کا ہر انسان دونوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کی سیرت میں اس درجہ مشابہت ہے کہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰؑ کی مانند اللہ کے رسول ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ چیلنج بھی دے سکتے ہیں کہ جتنی مشابہت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت محمدؐ کی ثابت ہے اتنی دنیا کے کسی انسان سے ثابت نہیں کی جا سکتی۔ اب اگر کسی میں ہمت ہے تو تاریخ کی ورق گردانی کرے اور کسی ایسی ہستی کو پیش کر کے دکھا دے۔

یہی نہیں۔ آپ اس پیشین گوئی کے الفاظ پر جتنا غور کریں اتنی ہی یہ حقیقت نکھرتی چلی جائیگی کہ حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی پر صادق نہیں آتی اور صرف آپ ہی پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔

اب ذرا اس پر غور فرمائیے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد سینکڑوں انبیاء بنی اسرائیل میں ظاہر ہونے والے تھے پھر ایک خاص نبی کی بعثت کا ذکر اس اہتمام کے ساتھ کیوں کیا گیا۔ آنے والا نبی چاہے موسیٰ علیہ السلام کی مانند ہو یا نہ ہو اس کی اطاعت بہر حال لازم تھی پھر ایک خاص نبی کی جو موسیٰ علیہ السلام کی مانند ہو اس کی اطاعت پر کیوں زور دیا گیا؟ اور صرف حضرت موسیٰؑ ہی نے ایسا نہیں کیا، بقول بائبل بعد کے انبیاء بھی اس کی آمد کی خبر دیتے رہے اور اس کی مختلف صفات بیان کرتے رہے۔ اس نبی کی شان ہی کچھ ایسی تھی کہ بنی اسرائیل کو اس کے ظہور کا بہت انتظار تھا۔ ملاکی نبی نے خدا کا یہ فرمان نقل کیا ہے:

"ہاں عہد کا رسول جس کے تم آرزو مند ہو آئے گا رب الافواج فرماتا ہے"

(ملاکی، ۳: ۱)

یہاں اس نبی کا تعارف "عہد کا رسول" سے کرایا گیا ہے۔ یعنی جس کی اطاعت کا عہد بنی اسرائیل سے اس قدر اہتمام کے ساتھ لیا گیا تھا اور شاید بار بار کہ اس نبی کا گویا نام ہی عہد کا رسول پڑ گیا تھا۔ ایسا اس لئے تو نہیں کیا گیا کہ بنی اسرائیل کی طرف سے اندیشہ تھا کہ یہ اس کی اطاعت سے انحراف کرنے والے تھے، شاید اس بنا پر کہ وہ ان میں سے نہیں بلکہ بنی اسمٰعیل سے آنے والا تھا۔

بہر حال وہ نبی اس حد تک مشہور ہو چکا تھا اور اس کے اتنے چرچے تھے کہ اس کا ایک نام ہی "وہ نبی" مشہور ہو چکا تھا۔ اس سلسلہ میں انجیل یوحنا کا یہ بیان خاص طور پر قابل توجہ ہے، جب یوحنا (یحییٰ) کی نبوت کی شہرت ہوئی تو۔

یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔

کیا تو نبی ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، ..... انھوں نے اس سے
یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے ؟
(یوحنا، بات ۱۹۔ ۲۵)

اس اقتباس سے یہ حقیقت ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل تین ہستیوں کی آمد کے منتظر تھے، ایلیاہ، مسیح اور وہ نبی، گویا اس نبی کا نام لینے کی ضرورت نہیں تھی، اس کی کسی نمایاں صفت بتانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ صرف "وہ نبی" کہہ دینا کافی تھا اور مخاطب فوراً سمجھ جاتا تھا کہ اس سے کون شخص مراد ہے، یعنی وہی نبی جس کی آمد کی خبر موسیٰ علیہ السلام اور بعد کے بہت سے انبیاء نے دی تھی۔

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ یوں تو دنیا میں خدا کے بے شمار انبیاء اور رسول آئے ہیں لیکن سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نبی "وہ نبی" (عربی میں) "النبی" (انگریزی میں) The Prophet[1] کے نام سے مشہور ہوا ہے ؟

جب کوئی کہتا ہے "سیرت النبی" "قال النبی" The Life of the Prophet The Prophet said، تو اس سے کون سی ہستی مراد لی جاتی ہے ؟ کیا آج علمی دنیا میں ان الفاظ سے سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور ہستی کو مراد لیا جا سکتا ہے ؟

اگر آپ کے نزدیک ستاروں کا شمار مشکل ہے تو ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساری دنیا کے انسان بھی مل کر شمار نہیں کر سکتے کہ کتنی بار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "النبی" اور The Prophet کہا اور لکھا جا چکا ہے۔

---

[1] اس وقت میرے سامنے عہد نامہ جدید (انجیل) کے دو انگریزی ترجمے ہیں اور دونوں ہی براہ راست یونانی سے کئے گئے ہیں (۱) The Twentieth century New Testament: New York 1904 اس میں "النبی" کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے The Prophet (۲) اور The New Covenant. New york 1946 اس میں اسی مقام (یوحنا بات ۱:۲۵) کا ترجمہ یہ ہے The Prophet.

دنیا اس نبی کی منتظر تھی، بنی اسرائیل اس کو "وہ نبی" کے نام سے جانتے تھے۔ اور جب "وہ نبی" ظاہر ہوگیا تو سب ہی نے اسے "النبی" "الرسول" The Prophet کہہ کر پکارا۔ دوست اور دشمن، اپنے اور پرائے، عقیدت مند اور ناقد سب نے "النبی" اور The Prophet کہا اس کے باوجود اس کو "وہ نبی" تسلیم نہ کیا جائے تو اس سے بڑھ کر قابل تعجب اور کیا بات ہوسکتی ہے؟ یعنی زبان سے تو سب "وہ نبی" The Prophet کہیں اور ساتھ ہی ساتھ انکار بھی کر دیں اس تضاد کی مثال شائد آسانی سے نہ مل سکے۔

جس کو دنیا نے ایک بار بھی "النبی" یا The Prophet نہ کہا ہو اس کو "وہ نبی" سمجھ لیا جائے تو اس فیصلہ پر کیا کیا جا سکتا ہے؟ کیا اب بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے "وہ نبی" ہونے میں کوئی شبہ باقی ہے؟!

پیشین گوئی کے الفاظ پر پھر ایک بار نظر ڈالئے۔ وہ نبی موسیٰؑ کی مانند ہوگا، اس کی اطاعت کا حکم ہے۔ اس سلسلے میں یہ سوال اٹھ سکتا تھا اور اٹھنا چاہیئے تھا کہ اگر کسی شخص نے (بنی اسرائیل سے، بنی اسمٰعیل سے یا کسی بھی قوم سے) یہ دعویٰ کیا کہ میں وہی نبی ہوں جس کی خبر موسیٰ علیہ السلام نے دی ہے اور میں موسیٰؑ کی مانند ہوں تو یہ بات کس طرح ثابت ہوگی کہ یہ شخص موسیٰؑ کی مانند ہے۔ اس کا قطعی فیصلہ تو ایک عرصے کے بعد ہی ممکن ہے اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا کہ کب اس کا تصادم زبردست طاقت سے ہوتا ہے۔ اور پھر دیکھنا ہوگا کہ غالب کون آتا ہے اور پھر موسیٰؑ علیہ السلام کی طرح کامیاب ہو کر ماننے والوں کی وہ رہنمائی کرتا ہے کہ نہیں؟ تو کیا فیصلہ کے دن تک اس کی نبوت معرض التوا میں رہے گی؟ بہرحال اس نبی کے معاصرین کے لئے یہ مسئلہ ضرور تھا۔ اس کا حل؟

کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اس نبی کی کوئی ایسی صفت یا نشانی بتا دی جاتی کہ اول دن ہی سے معلوم ہو جاتا کہ یہ "وہ نبی" ہے اور حضرت موسیٰؑ سے مشابہت ثابت ہونے کے وقت تک انتظار نہ کرنا پڑتا؟ یقیناً خدا کے نزدیک ایسی بہت سی صورتیں ممکن تھیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی:

دنیا بھر کی قوموں اور خاندانوں میں سے صرف ایک خاندان کا انتخاب کر لیا جاتا اور اسی خاندان سے انبیاء اٹھائے جاتے اور اس کا اعلان کر دیا جاتا تاکہ جب بھی کوئی اس خاندان سے باہر نبوت کا دعویٰ کرتا اس کو جھوٹا سمجھ لیا جاتا۔

حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا کہ نبوت کے لئے اسی کو چن لیا گیا اور حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کا انتخاب کیا گیا اور پھر ان ہی کی اولاد سے انبیاء مبعوث ہوتے رہے۔ اس طرح اب لوگوں کو اس کشمکش میں مبتلا ہونا نہیں پڑتا تھا کہ یہ شخص سچا نبی ہے یا جھوٹا مدعی۔ یہ سلسلہ مدتوں تک چلتا رہا۔

اب تکوینی مصالح کی بنا پر ایک خاص نبی کی بعثت مقصود تھی اور سب کے لئے اس کی اطاعت بھی لازمی قرار دی جاری تھی لہٰذا اس غیر معمولی شخصیت کی یہ واضح نشانی بتادی گئی کہ وہ خاص نبی بنی اسمٰعیل سے ہوگا۔ یعنی پے در پے سینکڑوں انبیاء بنی اسرائیل میں پیدا ہوتے رہیں گے اور ادھر بنی اسمٰعیل میں کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جب بھی بنی اسمٰعیل میں کوئی شخص نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھے تو سمجھ لینا کہ یہ وہی نبی ہے۔

رہا اس شبہ کا امکان کہ ضروری نہیں کہ جو مدعی بنی اسمٰعیل سے اٹھے وہ سچا ہی نبی ہو۔ اس کا ازالہ اس طرح ممکن ہے کہ یہ اعلان کردیا جائے کہ [illegible] اسمٰعیل سے "وہی نبی" ظاہر ہوگا جو پہلا اور آخری نبی ہوگا تاکہ کسی بھی شبہ کا امکان نہ رہے [illegible] وہ نبی آئندہ آئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت اسم[illegible] میں ہزاروں سال تک کسی فرد نے بھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس نوعیت کا پہلا اور آخری [illegible] جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی کیا ہے۔ چنانچہ جب قرآن نے مخاطبین کو اس طرف متوجہ کیا کہ:۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (یٰسین)[1]

اتارا زبردست رحم والے نے تاکہ تو ڈ[illegible] قوم کو کہ ڈر نہیں سنا ان کے باپ دادوں نے سو ان کو خبر نہیں۔

تو کسی کی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ اس کی تردید کر سکے اور بتائے کہ بنی اسمٰعیل میں آپ سے پہلے بھی کوئی نبی آیا ہے۔

اب آپ کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہوگی کہ حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کے بعد یہود کیوں مدینہ میں آکر بس گئے تھے۔ کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ انھیں علم تھا کہ بنی اسمٰعیل میں ایک نبی

---

[1] یہی مضمون سورہ القصص ۵ اور السجدہ ۱ میں بھی دہرایا گیا ہے۔

ظاہر ہونے والا ہے اور وہ ہجرت کر کے یثرب آئے گا۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ کی بعثت تک اس نبی کے چرچے تو بہت رہے لیکن نام سے شہرت نہیں ہوئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ کسی ممتاز شخصیت کے نام پر اپنی اولاد کے نام رکھ لیا کرتے ہیں اس صورت میں اشتباہ کا امکان بہر صورت رہتا ہے کہ اس نام سے کون سا شخص مراد ہے یہی معاملہ اس نبی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اس میں ایک لطیف نکتہ بھی ہے۔ بعض شخصیات اپنے نام سے اتنی مشہور و معروف نہیں ہوتیں جتنی اپنے لقب یا منصب سے ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جب کسی ملک میں ہم کہتے ہیں کہ شہنشاہ، صدر، سلطان یا وزیر اعظم نے یہ حکم جاری کیا ہے تو نام جانے بغیر ہر شخص سمجھ جاتا ہے کہ اس سے ملک کا حاکم اعلیٰ مراد ہے اور اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا۔ لیکن ایسا ہونا چند صورتوں کے ساتھ مقید ہے۔

(۱) اس طرح شخص مخصوص صرف اسی علاقہ میں پہچانا جا سکتا ہے جس میں اس کی حیثیت مسلم ہو۔ مثلاً سعودی عرب میں جب شاہ یا ملک کہا جائیگا تو وہیں کا شاہ یا ملک مراد ہوگا لیکن جب کسی دوسرے ملک میں شاہ یا ملک بولا جائیگا تو وہیں کا بادشاہ مراد ہوگا۔ یہی صورت وزیر اعظم اور صدر کے معاملہ میں ہوگی۔

(۲) منصب سے اسی وقت تک وہ شخص پہچانا جائے گا جب تک وہ اس منصب پر فائز اور زندہ بھی رہے گا۔ معطل ہو جانے یا مر جانے کے بعد اب اس منصب سے وہی شخص مراد ہوگا جو اس وقت اس پر فائز ہوگا۔

(۳) اس طرح منصب سے کوئی شخص ساری دنیا میں اور ہمیشہ مشہور و معروف نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر ملک کا حاکم اعلیٰ الگ ہوتا ہے اور مختلف لوگ اس پر فائز ہوتے رہتے ہیں۔

(۴) ایک وقت میں ایک منصب پر ایک ہی شخص فائز ہو ورنہ اشتباہ ناگزیر ہو جائے گا۔ مثلاً کسی ملک میں اگر دو صدر، یا دو وزیر اعظم ہوں تو پھر مخاطب نہیں سمجھ پائے گا کہ اس سے کون سا صدر یا وزیر اعظم مراد ہے۔

اس تمہید کو ذہن میں رکھنے کے بعد اب منصب نبوت پر غور کیجئے دیکھئے حضرت موسیٰ کے زمانہ ہی سے ایک نبی (جس کی آمد کی حضرت موسیٰ نے بشارت دی تھی) "وہ نبی" "النبی" "الرسول" The Prophet کے نام سے مشہور ہو چکا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک جب بھی کوئی یہ نام لیتا اس سے وہی نبی مراد ہوتا تھا جس کا ذکر موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا کیونکہ اس طویل مدت میں اس منصب کے ساتھ کسی دوسری ہستی پر اس کا اطلاق کبھی نہیں ہوا تھا اور عقل یہی کہتی ہے کہ تا اختتام عالم اس لقب یا مخصوص صفت کا اطلاق کسی دوسری ہستی پر نہ ہو ورنہ پھر شبہ پیدا ہو جائے گا کہ "النبی" سے کون سا "النبی" مراد ہے۔

گویا اس اسم کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ جب "وہ نبی" یا النبی (The Prophet) ظاہر ہو جائے تو پھر کوئی "النبی" (یا The Prophet) کے نام سے ظاہر یا مشہور و معروف نہ ہو۔

اور اگر کوئی ہستی ہر ملک اور ہر زمانہ میں اسی نام سے مشہور و معروف ہو یعنی دنیا کے جس خطہ میں اور کسی بھی زمانہ میں جب "النبی" کہا جائے تو مخاطب فوراً سمجھ لے کہ اس سے کون مراد ہے تو اس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ اس ہستی کی نبوت دنیا کے ہر خطہ اور ہر زمانہ پر حاوی ہے۔

اب یہ فیصلہ دنیا کو کرنا ہے کہ وہ کون سی ہستی ہے جو ہزارہا سال سے "النبی" "الرسول" The Prophet کے نام سے مشہور چلی آرہی ہے بالخصوص جب کہ اس نام یا منصب کا اطلاق اس ہستی کے سوا کسی اور پر نہ ہوا ہو، نہ ہو رہا ہو۔

روشنی ستاروں سے بھی ملتی ہے اور شمس و قمر سے بھی۔ اگر کوئی یہ کہے میں نے ایک ستارہ دیکھا ہے تو سننے والا کہے گا، دیکھا ہوگا کوئی ستارہ، آسمان میں سیکڑوں ستارے ہیں۔ لیکن جب کوئی یہ کہتا ہے کہ میں نے آفتاب دیکھا ہے تو کم از کم اس دنیا میں تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون سے آفتاب کا ذکر کر رہے ہو۔

اگر رات کا وقت ہو اور لوگ روشنی کے محتاج اور منتظر ہوں کہ کب سورج طلوع ہوتا ہے اور کب ہمیں روشنی ملتی ہے۔ پھر انتظار کے بعد آفتاب طلوع ہو اور دنیا پکار اٹھے کہ آفتاب طلوع ہو گیا اس وقت اگر کوئی یہ کہے کہ کون سا آفتاب نکلا ہے، یا ہٹ دھرمی سے کہتا رہے کہ معلوم نہیں کون سا آفتاب طلوع ہوا ہے اور طلوع ہوا بھی کہ نہیں تو پھر اس شخص کے بارے میں دنیا جو کچھ کہے گی سب جانتے ہیں۔

مثل مشہور ہے جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ دنیا (بالخصوص بنی اسرائیل) ہزاروں سال سے منتظر تھی کہ کب "وہ نبی" "النبی" The Prophet ظاہر ہو۔ جب "وہ نبی" ظاہر ہو گیا ساری دنیا نے شعوری یا لاشعوری طور پر یک زبان ہو کر اسے "النبی" اور The Prophet کے نام سے جان لیا، لاکھوں بار اسی نام سے پکار لیا اور پکار رہی ہے، کوئی دوسرا اس نام سے نہ ظاہر و مشہور ہوا نہ ہے، اس پر بھی اگر کوئی یہی کہتا رہے کہ "وہ نبی" "النبی" ظاہر نہیں ہوا یا یہ کون سا "النبی" یا The Prophet ہے تو اس کے بارے میں کیا کہا جائے؟!

اب تک ہمارا روئے سخن یہود و نصاریٰ کی جانب تھا جو بائبل کو الہامی کتاب اور موسیٰؑ کو خدا کا نبی مانتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا نبی تسلیم نہیں کرتے بلکہ کسی بھی مذہب کے قائل نہیں۔ ان لوگوں کو بھی کم از کم ان مسائل پر غور کرنا ہی پڑے گا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً دو ہزار سال پہلے حضرت موسیٰؑ نے یہ خبر دی تھی کہ میری مانند ایک نبی ظاہر ہوگا۔ آج حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دنیا کے سامنے ہے۔ اور ناقابل انکار مشابہت بھی۔

کیا کوئی انسان بالقصد اپنی پیدائش سے وفات تک کی زندگی کو کسی نمونہ میں ڈھال کر مشابہت پیدا کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو وہ کون سی ہستی ہے جس کو دو ہزار سال پہلے سے علم تھا کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں ایک نبی پیدا ہوگا جو موسیٰؑ کی مانند ہوگا۔

اور یہ کہ بائبل میں جس نبی کی آمد کی خبر دی گئی تھی وہ النبی" (The Prophet "وہ نبی" کے نام سے مشہور ہو چکا تھا پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس نام سے مشہور و معروف ہوئے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا کے سارے انسان —— جو آپ پر ایمان رکھتے ہیں وہ بھی اور جو نہیں رکھتے وہ بھی بلکہ جو کسی مذہب کے بھی قائل نہیں وہ بھی آپ کو ہی "النبی" اور The Prophet کہتے ہیں مگر مانتے نہیں!

بحث و نظر

مسلمان باپ کی ذمہ داریاں

مولانا صدر الدین اصلاحی

مسلمان کی بنیادی ذمہ داریاں

مسلمان بحیثیت مسلمان، جو ذمہ داریاں اپنے سر رکھتا ہے، ان کو اگر اصولی طور سے تقسیم کیا جائے تو وہ کل تین قسموں کی نظر آئیں گی۔ ان میں سے ایک کا تعلق تو تمام تر اس کی اپنی ذات سے ہوگا، دوسری کا اس کے اپنے اہل و عیال سے ہوگا، اور تیسری کا تعلق باقی انسانوں سے ہوگا۔ پہلی دو ذمہ داریوں کا تعین یہ ارشادِ الٰہی کرتا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا... الخ (التحریم - ۶)

اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو (جہنم کی) آگ سے ... الخ۔

اور تیسری کی وضاحت یہ آیتِ کریمہ کرتی ہے:-

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران - ۱۱۰)

تم وہ بہترین گروہِ انسانی ہو جو لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم (انھیں) بھلائی کا حکم دیتے ہو۔ برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

جہاں تک پہلی ذمہ داری کا سوال ہے، وہ سب سے مقدم بھی ہے سب سے اہم بھی ہے، اور سب سے بڑی اور بھاری بھی، کیونکہ اس کا ادا ہو سکنا اپنی استطاعت کی حد تک اُن سارے ہی فرائض و ہدایات کی انجام دہی پر موقوف ہے جن کے مجموعے کا نام دین اور شریعت ہے، یا قرآن اور حدیث۔

دوسری ذمہ داری بھی ایک زبردست اور خاص اہمیت کی مالک ہے۔ اللہ رب

العالمین نے اہلِ ایمان کو جس طرح اس امر کی تلقین کی ہے کہ "اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ" اسی طرح، ساتھ کے ساتھ، اس بات کی بھی تاکید کر رکھی ہے کہ 'اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ' آیت کا یہ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ ان دونوں ذمہ داریوں میں عملاً تفریق نہیں کی جا سکتی۔ پہلی کو اولیت ضرور حاصل ہے اور وہ اہم تر بھی ہے، پھر اس کی بجا آوری ہر حال میں لازمی اور ناگزیر بھی ہے، لیکن دوسری کو بھی کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اگر اسے نظر انداز کر دیا گیا تو پہلی سے بھی آدمی عہدہ برآ نہیں قرار پا سکتا، خواہ اس کے لیے اس نے کتنی ہی ریاضتیں اور مجاہدے کر ڈالے ہوں۔

تیسری ذمہ داری بھی اپنی جگہ ایک عظیم اور بہت آزما ذمہ داری ہے، اور اسے ادا کیے بغیر ایک مسلمان کا واقعی معنوں میں مسلمان کی حیثیت سے، جانا پہچانا جانا مشکل ہے۔ یہ اس لیے کہ قرآن حکیم نے امر المعروف اور نہی عن المنکر کو اہلِ ایمان کی ایک لازمی صفت اور ضروری علامت قرار دیا ہے، اللہ کے رسولؐ نے اس صفت کی غیر موجودگی کو ایمان سے بے بہرہ ہونے کا ثبوت بتایا ہے، اور سب سے آخری بات یہ ہے کہ معبود برحق نے امت مسلمہ کے وجود کی غرض وغایت ہی اسی کام کو فرمایا ہے۔ اگر مقصد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ذمہ داری بھی فی الواقع باقی دونوں ذمہ داریوں جیسی ایک ذمہ داری ہے۔ کیونکہ اس کا مدعا بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی ذات اور اپنے اہلِ وعیال ہی کی طرح دوسرے بندگانِ خدا کو بھی نارِ جہنم سے بچانے کی کوشش کیجئے اور مسلسل کی جاتی رہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا مقام پہلی دونوں ذمہ داریوں کے بعد آتا ہے، مگر آتا بہر حال ہے اور بالکل غیر منفک طور سے آتا ہے، ایسے لزوم کے ساتھ آتا ہے کہ اسے انجام دیے بغیر خود اپنی ذات کو بھی آخرت کی تباہی سے نہیں بچایا جا سکتا۔

اس طرح یہ کہنا چاہیے کہ یہ تینوں ذمہ داریاں الگ الگ تین ہونے کے باوجود فی الواقع ایک ہی ہیں، یعنی ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں ہیں، باہم مربوط اور پیوستہ۔ اور یہ پورا سلسلہ ہی اس فریضے کے پورے مفہوم کی صورت گری کرتا ہے جسے انجام دینے کو 'اسلام' اور انجام دینے والے کو 'مسلمان' کہا گیا ہے۔

'مسلم تاریخ' کے بنانے والے عوامل جو بھی رہے ہوں، لیکن جہاں تک 'اسلامی تاریخ' کا تعلق ہے، اس کی تشکیل ہمیشہ سے یہی تینوں چیزیں کرتی رہی ہیں، آج بھی کررہی ہیں، اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ اس لیے پوری طرح نہ اسلام کو سمجھا جاسکتا ہے نہ صحیح معنوں میں مسلمان کو جانا پہچانا جاسکتا ہے، نہ ٹھیک طور سے 'اسلامی تاریخ' سے شناسائی حاصل کی جاسکتی ہے جب تک مسلمان کی ان تینوں بنیادی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ آئیے اس وقت درمیانی کڑی کو لےلیں اور ذرا تفصیل سے یہ معلوم کرلیں کہ ایک مسلمان پر اس کے اپنے بچوں کے بارے میں جو بنیادی ذمہ داری ڈالی گئی ہے وہ کیا معنیٰ رکھتی ہے اور کس طرح ادا کی جاسکتی ہے ؟ زیادہ صاف اور سادہ لفظوں میں یہ کہ 'مسلمان باپ' کیسا ہوتا ہے، اور اپنے بچوں کے بارے میں اس کی اصل فکر اور سب سے مقدم کوشش کیا رہتی ہے یا کیا رہنی چاہیے ؟

ایک اصولی حقیقت

اس بحث کی تفصیل میں جانے سے پہلے ایک اصولی حقیقت کا جان اور سمجھ لینا مناسب رہے گا:۔

دنیا کا ہر بامقصد گروہ، جو اپنے مقصد اور نصب العین کا واضح تصور رکھتا ہو اور اس کے بارے میں سنجیدہ اور مخلص بھی ہو، اس بات پر کڑی نظر رکھتا ہے اور اس کے لیے ہر ممکن اہتمام بھی کرتا ہے کہ اس کی صفوں میں نئے داخل ہونے والے افراد اس نصب العین کے سچے شناسا اور اس کے مخلص کارکن ثابت ہوں ان کا ذہن اس مقصد کے لیے بالکل یکسو، ان کے جذبات اس سے پوری طرح سرشار، اور ان کی توانائیاں اس کی بقاء و ترقی کی خاطر کی جانے والی جد و جہد پر اچھی طرح مرکوز ہوں اور یہ بالکل فطری بات ہے۔ ایسا ہونا ہی چاہیے۔ اس بارے میں زیادہ حساس، پرجوش اور مقصد کے دھنی لوگوں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی آئندہ نسل کے دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اس کے تئیں اپنی مساعی اور تدابیر کا آغاز کر دیتے ہیں۔ نازی جرمنی کی واضح ترین

مثال ابھی کل کی بات ہے۔ اس کے ہاں ماں بننے والی خواتین کے ذہنوں کو اور ان کے افکار و خیالات اور جذبات کو نازی ازم کی تیز تیز خوراکیں دی جاتیں، تاکہ ان کی ذہنی اور فکری لہروں میں یہ فلسفۂ حیات سرایت کر جائے اور پھر ان کے اندر پروان چڑھنے والے جنینوں کے زیر تشکیل لاشعور میں پہلے دن سے اس کا انعکاس شروع ہو جائے۔ اس کا یہ طرزِ عمل یقیناً اس کے اخلاص فی المقصد کا ایک مثالی مظہر تھا۔ نازی ازم کا نظریہ خواہ کتنا ہی غلط رہا ہو، مگر اس کی تعمیر و ترقی کے لیے جرمنی نے جو تدبیر اختیار کی تھی اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اسلام نے بھی اس بارے میں کچھ کم دور نگاہی سے کام نہیں لیا ہے۔ اس نے جہاں یہ چاہا ہے کہ مسلمان اپنی اولاد کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا کر اٹھائیں، وہیں اس کے لیے اس نے انہیں ایسی تدبیروں کی بھی تلقین کر رکھی ہے جن کا سلسلہ اولاد کے آغازِ وجود سے بھی پہلے سے شروع ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو ذرا غور سے سنیے:

إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا۔ (ابو داؤد، جلد اول۔ باب فی جامع النکاح)	جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جانے کا ارادہ کرے تو پہلے بسم اللہ پڑھ کر یہ دعا کرے کہ خدایا ہم دونوں کو شیطان (کے شر) سے محفوظ رکھ، اور ہماری اس اولاد سے بھی شیطان کو دور رکھیو جو تو ہمیں عطا فرمائے۔

اس کے بعد حضورؐ کے اس عمل کو بھی، جو دراصل سارے مسلمانوں کے لیے آپؐ کی ایک واجب الاتباع سنت کی حیثیت رکھتا ہے، سامنے رکھیے:

عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي أَوْفَىٰ عَنْ أَبِيهِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَذَّنَ فِي أُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ حِينَ وَلَدَتْهُ فَاطِمَةُ بِالصَّلٰوةِ۔	عبد اللہ بن ابی اوفیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حسن بن علی کے کان میں، جب کہ وہ حضرت فاطمہ کے ہاں تولد پذیر ہوئے تھے،

نماز کی اذان جیسی اذان دیتے دیکھا ہے۔ (ابو داؤد، جلد دوم، باب فی المولود یؤذن فی اذنہ)

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد، اور آپؐ کا یہ عمل محض ایک مذہبی رسم کے طور پر نہیں تھا، نہ صرف برائے برکت تھا، بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد کارفرما تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان بچہ کا اولین جرثومۂ حیات جب وجود میں آئے تو غیر محسوس طور پر خداشناسی کا جوہر لیے ہوئے آئے، اور اس کے والدین کی توجہ الی اللہ ان کی ذہنی اور جذباتی لہروں کے ذریعہ اس کے اندر بھی سرایت کر جائے۔ اور پھر جب وہ اس دنیا میں قدم رکھے تو اس کے اندرونی حواس کی گہرائی اور اس کا لاشعور سب سے پہلے جس چیز کو اپنے اندر جذب کرے وہ اسلام کی روح ہو، اس کے کانوں سے گذر کر اس کے ذہن کی تہوں میں جس حقیقت کا احساس اترے وہ اللہ تعالیٰ کی لاشریک کبریائی کا، اس کے رسولؐ کی رسالت کا، اور اس کی بندگی کے اولین و کامل ترین مظہر (نماز) کا احساس و تصور ہو۔

جس اعلیٰ مقصد کی فکر کا اتنی دور سے اہتمام شروع ہو گیا ہو، ممکن نہیں کہ بعد کے مراحل میں اس کی طرف سے بے اعتنائی یا کم اعتنائی کو راہ دی جا سکی ہو گی۔ اس بے نظیر مقصد پسندی کا عین فطری تقاضا تھا کہ بچہ جوں جوں ایک باشعور ہستی کی حیثیت اختیار کرتا جائے اس کے قلب و نظر میں مقصد کے ابتدائی اور غیر شعوری احساس کو ہر ممکن تدبیر سے برابر جلا دی جاتی رہے، اور اس پر اسلام و خدا پرستی کا رنگ چڑھاتے رہنے میں کسی کوتاہی سے کام نہ لیا جائے۔ چنانچہ ٹھیک ایسا ہی کیا گیا ہے۔ حضورؐ کے بعض ارشادات ملاحظہ ہوں:

مَنْ وُلِدَ لَہٗ وَلَدٌ فَلْیُحْسِنْ اِسْمَہٗ وَاَدَبَہٗ۔ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ ص۲۷۱)	جس کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو اسے چاہیے کہ اس کا کوئی اچھا سا نام رکھے، اور پھر اسے 'ادب' سکھاتے رہو۔
مَانَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ (ترمذی، جلد دوم باب ما جاء فی ادب الولد)	کوئی باپ اپنی اولاد کو حسنِ ادب سے بہتر کوئی چیز عطا نہیں کرتا۔

ان ارشادات میں 'تادیب' اور 'حسنِ تادیب' کے جو الفاظ ہیں، یاد رکھیے کہ وہ

انسانیت کے ہادیِ اعظم اور نفوسِ انسانی کے مُزکّیِ بے عدیل کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں، اور امتِ مسلمہ کے افراد کو سامنے رکھ کر فرمائے گئے ہیں۔ اس لیے ان کا مدعا عام قسم کی 'تادیب' اور حسنِ تادیب کے مفہوم سے مختلف، بہت مختلف ہے۔ یہ مدعا صحیح ترین اسلامی تعلیم و تربیت کا مدعا ہے۔ مقصود ارشاداتِ عالیہ کا یہ ہے کہ اپنی اولاد کو ایسے خیالات سے، ایسی عادات و اطوار سے، ایسے افکار سے عقائد سے، ایسے کردار سے اور ایسی سیرت سے آراستہ کرتے رہو جن سے امت مسلمہ کے افراد کو لازماً آراستہ ہونا چاہیے، اور اس طرح اسے ایک ایسے خاص قالب میں ڈھال دو جو ظاہر اور باطن ہر حیثیت سے 'مسلمان' ہو، اور کسی پہلو سے بھی مسلمان کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ یہ اسی حسنِ تادیب کا ایک نمایاں جزو تھا جو اس حکم رسول میں مذکور ہے:۔

عَلِّمُوا الصَّبِیَّ الصَّلٰوۃَ ابْنَ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْہُ عَلَیْھَا ابْنَ عَشَرَۃٍ۔ (ترمذی، جلد اول، باب ماجاء متی یؤمر الصبی بالصلوۃ)	بچہ جب سات برس کا ہو جائے تو اسے نماز سکھاؤ، اور جب وہ دس برس کا ہو جائے (اور پھر بھی نماز نہ پڑھے) تو اسے سزا دو۔

نماز ہی جیسی بات روزے کی بھی ہے۔ ہدایت ہے کہ بچوں کو روزہ رکھنے کی ترغیب دی جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دیگر احکام شریعت کی طرح نماز اور روزے کا احکام بھی بلوغ کے وقت ہی فرض ہوتے ہیں، اس سے پہلے کوئی بھی ان کا مکلف اور عند اللہ مسئول نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اگر مذکورہ ہدایات مسلمانوں کو دی گئی ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان ہدایات کی غایت وہی 'حسنِ تادیب' ہے جس کا ہر مسلمان کو اپنی اولاد کے سلسلے میں ذمہ دار بنایا گیا ہے۔

بظاہر اولاد کی اس تعلیم و تربیت کے سلسلے میں باپ کی ذمہ داری اس وقت اختتام کو پہنچ جانی چاہیے جب وہ جوانی کی سرحدوں میں داخل ہو جائے، اور اب اسے سنِ رشد کو پہنچ کر اپنی اصلاح و تربیت کا خود ذمہ دار قرار دیا جانا چاہیے۔ لیکن عملی حقیقت چونکہ یہ نہیں ہے کہ ہر جوانی لازماً رشد و صلاح اور احساسِ فرض ساتھ لیے آتی ہو۔ اس لیے ایسی اولاد کے باپ جو بالغ ہونے کے باوجود اپنے مسلمان ہونے

کے حق سے عملاً ناآشنا یا کم آشنا ہو، اس ذمہ داری کے بوجھ سے اب بھی سبک دوش نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ کیونکہ باپ کی حیثیت سے نہ سہی، ایک عام مومن کی حیثیت سے اُس کی اُس تیسری ذمہ داری کے تحت تو وہ بہر حال اب بھی آتی ہی ہے، اور آتی ہی رہے گی جو معاشرے کی اصلاح، اور اسے معروف کی تلقین اور منکر کی روک تھام کے سلسلے میں اس پر عائد ہے۔ اگر کوئی صاحبِ ایمان اس فریضے سے غافل نہیں ہے، اور خلق خدا کو بھلائی اور تقویٰ سے بہرہ ور کرتے رہنا اور برائی اور خدا فراموشی سے باز رکھنے کی جد وجہد کرنا وہ اپنی دینی اور ایمانی ذمہ داری سمجھتا ہے، تو بالکل فطری بات ہے کہ اس سلسلے میں اس کی نگاہ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اپنے عزیز ترین قریب کے لوگوں، بالخصوص اپنی اولاد ہی پر پڑے گی، اور پڑتی رہے گی۔ کیونکہ یہ امر، اور یہ نہی کسی معمولی مقصد کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ اپنے امکان کی حد تک انھیں آخرت کی ناکامیوں سے بچانے کے لیے ہوتی ہے۔ اور کوئی غلط کار سے غلط کار آدمی بھی ایسا نہیں کرسکتا کہ وہ دنیا جہان کو تو اس عظیم ہلاکت سے بچا لینے کے لیے جان فشانیاں کرے، مگر خود اپنے قریب ترین عزیزوں کے متعلق بے فکر بنا رہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ انھیں بھی بس عام سطح پر رکھے۔ انسانی فطرت اس عجیب و غریب "مساوات" کی کبھی روادار نہیں ہو سکتی۔ معاملے کے اس پہلو کو اگر سامنے رکھیے تو اس حقیقت کے سمجھ لینے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ اولاد کا سنِ رُشد اور اس کا وقتِ بلوغ ہی نہیں، اس کا دورِ کہولت بھی اس کے مسلمان باپ کو اس کی تادیبِ حسن، اس کی اصلاح اور اس کی تلقینِ خیر کی ذمہ داریوں سے، اگر ضرورت باقی ہو، کو بری الذمہ نہیں قرار دلا دے سکتا، بلکہ بعض حالات میں تو، جب کہ اولاد کی غلط روی زوروں ہی پر ہو، اس کی تلقین و تادیب اور افہام و تفہیم کا فریضہ اس کے باپ کا ایک دائمی فریضہ بن جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام کا اسوہ

اس بارے میں انسانیت کے عالی مقام رہنماؤں اور خدا پرستی کے مثالی

نمونوں، انبیاء علیہم السلام کا اسوہ امر مطلوب کو پوری طرح روشن کر دیتا ہے۔ یہ حضرات اپنی اولاد کو جس بات کی نصیحت اور تاکید کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے وہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتی کہ بچو! اپنے خدا ہی کے ہو کے رہنا۔ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی، اور ان کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں بھی قرآن مجید کا بیان ہے کہ:

.... وَوَصّٰى بِهَا اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (بقرہ - ۱۳۲)	.... اور اسی ملت (اور طریقے پر قائم رہنے) کی تاکید ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو، اور پھر یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو کی تھی۔ (انھوں نے کہا تھا) کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین (اسلام) پسند فرمایا ہے۔ سو تم ہرگز نہ مرنا مگر (اسی) اسلام کی حالت پر۔

"سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اسی اسلام کی حالت پر" کے فقرے کا زور و تاکید دیکھنے کے قابل ہے۔ اسلام کی حقیقی روح کا بے نظیر مظہر بھی ہے۔ اور اس میں دینی حقائق و معانی کی پوری دنیا بھی سمٹی ہوئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا بھی، اور حضرت یعقوبؑ کا بھی، مدعا یہ فرمانے سے یہ تھا کہ بیٹو! مسلم ہی بن کر جینا اور مسلم ہی کی حیثیت میں اس دنیا سے رخصت ہونا۔ تمہاری زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہ گذرنے پائے جب تم اپنے خداوند کے حضور اپنے پورے وجود کو سپرد کیے ہوئے نہ ہو۔ جب اس کی رضا کی طلب پر تمہاری نگاہ جمی ہوئی نہ ہو، جب اس کی اطاعت گذاری کے لیے تم سراپا چشم و گوش نہ بنے ہوئے ہو۔ یاد رکھو اس راہ میں بہت سی مزاحمتیں پیش آئیں گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود تمہارا اپنا نفس اس خود سپردگی میں اکتاہٹ محسوس کرنے لگے، مگر خبردار! ان مزاحمتوں اور ان اکتاہٹوں کے آگے کبھی ہتھیار نہ ڈالنا۔ تمہیں ہر طرح کے حالات میں اپنے آقا و مولا سے چمٹے رہنا چاہیے۔ تم اللہ کے دین کے امین ہو اور اس کی کامل اور غیر مشروط بندگی ہی تمہاری زندگی کا پہلا اور آخری فریضہ ہے۔ اس لیے

جینا تو اسی کے لیے ، اور مرنا تو اسی کے لیے گذاری کی حالت میں۔

پھر بات اتنی ہی نہیں ہے کہ انبیاء کرام اپنی اولاد کو یہ وصیت صرف انہیں رواں زندگی ہی میں کرتے رہے ہوں، نہیں، اس کی ضرورت انھیں اس وقت بھی یاد رہتی، اور اس فکر کا غلبہ ان کے ذہن پر اس لمحہ بھی برقرار رہتا جو ان کی حیات دنیوی کا آخری وقت اور آخری لمحہ ہوتا۔ مثال کے طور پر، خود قرآن کریم کی شہادت کے مطابق حضرت یعقوب جس وقت آخرت کی دہلیز پر قدم رکھنے لگے تو انھیں اپنے فرزندوں کے بارے میں اس کے سوا اور کوئی فکر اور دوسری کوئی آرزو نہیں تھی کہ وہ ان کے بعد بھی اللہ کی لاشریک بندگی کے راستے پر پوری یکسوئی اور استقامت کے ساتھ چلتے رہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی غرض کی خاطر ان سے سوال کے انداز میں فرمایا:

مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ (بقرہ۔ ۱۳۳) تم لوگ میرے بعد کس کی بندگی کروگے۔

یہ سوال کا انداز انھوں نے اس لیے اختیار کیا تھا تاکہ بات بیٹوں کے سامنے زیادہ موثر طریقے سے آسکے اور انھیں اس امر کی اچھی طرح تنبیہہ ہو جائے کہ حق اور اتباعِ حق کے معاملے میں کم اعتنائی اور کم کوشی کو کبھی قریب نہ آنے دیں گے۔ آنجناب کی اس وصیت اور اس تاکید و تنبیہہ سے ایک طرف تو اپنی اولاد کی حقیقی بہی خواہی کا، دوسری طرف دین کی بے نظیر محبت اور فکرمندی کا، تیسری طرف اپنے فرض کی ادائی کے غیر معمولی احساس کا جو اظہار ہوتا ہے اس کا اندازہ آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا۔ آخر وہ اس امر واقعی سے ناواقف تو نہیں تھے کہ جنھیں وہ خطاب فرما رہے ہیں وہ ان کی اپنی ہی اولاد ہیں، پیغمبر زادے ہیں، ایک خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ ہیں، رسالت کی چھاؤں میں پلے بڑھے ہیں، اور خود ان کی اپنی ہی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھے ہیں۔ ایسے بندگانِ خاص کے بارے میں یقین کی حد تک توقع اسی بات کی رکھی جا سکتی تھی کہ وہ کبھی اپنے مقام و منصب کو نہ بھولیں گے اور اللہ کے دین اور اس کی رضا کے لیے ہی جینا مرنا ان کا شعار ہوگا، مگر پیغمبر کی شدتِ فکر و شدتِ احتیاط دیکھیے کہ وہ ان سب باتوں کے باوجود دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے بھی ان کے جذبۂ عبودیت

اور احساس دین و ایمان کو نہایت موثر اور خوب صورت انداز میں مہمیز کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اور جب سعادت مند بیٹے پوری عابدانہ شان اور پورے مومنانہ عزم کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ:۔

نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ آبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (بقرہ۔۱۳۳)	ہم (آپ کے بعد بھی بدستور) آپ (ہی) کے معبود اور آپ کے بزرگوں، ابراہیم اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کرتے رہیں گے جو تنہا معبود برحق ہے، اور اسی کے طاعت گذار رہیں گے ۔

تب جا کر وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں ۔

اور امر واقعی کی آخری حد یہ بھی نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ہے کہ جس پیغمبر کے کوئی اولاد نہ ہوتی جس سے وہ اپنے بعد اپنے مشن کی علمبرداری کی توقعات وابستہ رکھ سکتا، وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا کہ اسے ایسی کوئی اولاد عطا فرما دی جائے ۔حضرت زکریاؑ اس کی واضح مثال ہیں ۔ وہ لاولد تھے ۔جب عمر کی اس حد تک پہنچ گئے جہاں پہنچ جانے کے بعد عام قانونِ طبیعی کے تحت اولاد کی کوئی توقع باقی نہیں رہ جاتی تو یہ دیکھ کر مضطر ہو اٹھے کہ دین کی جو خدمت انجام دیتے رہے ہیں مستقبل میں اس کے برقرار رہنے کے امکانات بڑی حد تک تاریک ہیں ۔ اُن کا تعلق اُس اسرائیلی قبیلے (بنی لاوی بن یعقوب) سے تھا جو بارہ قبیلوں پر مشتمل پوری اسرائیلی قوم میں سے مقدس کی خدمت اور دین کی نگہداشت کے لیے مخصوص تھا، اور اس قبیلے کی بھی شاخ 'بنی ہارون' اس خدمت کے سب سے اعلیٰ کاموں کے لیے خاص تھی ۔ حضرت زکریا اسی شاخ کے ایک خاندان (بنی ابیاہ) کے سردار تھے، اور اس لیے مقدس کی خدمتِ خاص کے منصب پر فائز تھے ۔ انھوں نے جب دیکھا کہ ان کی زندگی کی شام آچکی ہے اور حال یہ ہے کہ نہ صرف بنی ابیاہ میں بلکہ پورے قبیلۂ بنی لاوی میں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس خدمت کا اہل ہو تو ان پر بے چینی کی کیفیت طاری ہو گئی، اور پھر اس

بے چینی کے عالم میں اپنے خدا کے حضور میں التجا پھیلا کر عرض پرداز ہوئے کہ:

رَبِّ اِنِّیْ وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ
وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا
وَّلَمْ اَکُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا
وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ
وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَھَبْ
لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ
وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ
وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا۔
(مریم، ۴-۶)

اے میرے مالک! میری ہڈیاں گھل چکی ہیں اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے۔ مالک! میں کبھی تجھ سے مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں (کی فرض ناشناسی) کا ڈر ہے، اور میری بیوی بانجھ ہے۔ سو اپنی عنایت خاص سے مجھے ایک وارث عطا کر دے جو میری وراثت کو سنبھالے اور آلِ یعقوب کا بھی وارث بنے، اور اے پروردگار اسے پسندیدہ انسان بنا۔

یقینی طور پر ان کی یہ درخواست کسی دنیوی وارث عطا کیے جانے کی درخواست نہیں تھی۔ کیونکہ اس درخواست کے الفاظ ایسا سمجھنے کی بالکل اجازت نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ایسا خیال کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ "ہمارا (یعنی اللہ کے پیغمبروں کا) کوئی وارث نہیں ہوا کرتا، ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقۂ عام ہوا کرتا ہے" (لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَةٌ۔ (بخاری، جلد دوم، کتاب الفرائض) پس حضرت زکریا کی یہ درخواست واضح طور پر ایک دینی وارث کی درخواست تھی، جو ان کے بعد ان کے چھوڑے ہوئے مشن کی خدمت اور علم برداری کا کام دے سکے ان کا یہ کہنا کہ "مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں کی فرض ناشناسیوں کا ڈر ہے، اس حقیقت کا ناطق گواہ ہے کہ انھیں اپنے خاندان میں، جو مقدس کی خدمات بجا لانے کا اصل ذمہ دار تھا، دور دور تک ایسا کوئی فرد نظر نہیں آرہا تھا جو اس فرض کو ادا کر سکتا اور اخلاقی اور دینی نقطۂ نگاہ سے اس عظیم اور مقدس منصب کا اہل ہوتا۔ اس لیے انھوں نے اپنے لیے جس وارث کی دعا کی تھی وہ ایک ایسا وارث تھا جو ان کی اور خانوادۂ یعقوب کی عملی صلاحیتوں اور دینی کارگزاریوں کا صحیح معنوں

میں وارث ثابت ہو سکتا۔

سچے اہل ایمان نے اسوۂ انبیاء سے کیا رہنمائی حاصل کی

یہ انبیاء علیہم السلام کا اپنا صرف ایک عمل نہیں تھا بلکہ انھوں نے اپنے اس عمل سے اپنے پیرووں اور بعد کے اہل ایمان کے لیے ایک بنیادی اہمیت کی سنت بھی چھوڑی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کا یہ اپنے اندر یہ تلقین رکھتا ہے کہ ہر مومن و مسلم کو اپنی اولاد کے بارے میں یہی روش اختیار کرنا چاہیے۔ اس کو اصل فکر، اصل تمنا اور اصل کوشش اس بات کی رکھنی چاہیے کہ اس کے بچے اور کچھ بن سکیں نہ ہی، مگر اپنے خدا کے سچے بندے ضرور بنیں۔ اسی کی وہ انھیں اچھی سے اچھی نصیحتیں اور موثر سے موثر وصیتیں کرتا رہے اور اسی چیز کو وہ ان کے لیے اپنا چھوڑا ہوا سب سے قیمتی ترکہ سمجھے۔ کیونکہ انسان کی اصل زندگی دنیا کی نہیں بلکہ آخرت کی زندگی ہے، اور اسی کی کامیابی اصل کامیابی، اور اسی کی ناکامی اصل ناکامی ہے۔ اس لیے ایک مخلص اور دور اندیش مسلمان کو اپنی اولاد کی تربیت اور ذہن سازی بھی اسی نہج کی کرنی چاہیے۔ کہ وہ اپنی توجہات کا حقیقی رخ آخرت ہی کی طرف رکھنے والا بن جائے۔ رہا دنیا کی ضرورتوں کا سوال تو ان کے لیے ہر شخص کی طبیعت میں خود ایک زبردست داعیہ موجود ہوتا ہے، جس کی بنا پر وہ آپ سے آپ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے، اور کرنے کے لیے اپنے کو مجبور پاتا ہے جب کہ آخرت کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ایک طرف تو وہی اصل زندگی ہے، دوسری طرف اس زندگی کے لیے زاد راہ مہیا کرنے اور کرتے رہنے کے لیے اس کی طبیعت میں کوئی محرک نہیں پایا جاتا۔ اس طبیعت کے محرکات عام طور پر لذت نوازی ہوتے ہیں۔ اور ان میں بلا کی طاقت بھی ہوتی ہے۔ اس لیے آدمی ان کا اثر قبول کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اولاد کو دنیا کی ضرورتوں کے لیے کچھ سکھایا پڑھایا ہی نہ جائے۔ ضرور سکھایا پڑھایا جائے۔ لیکن ان کا وہی مقام رکھا جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔ مقدم کام کو مقدم۔ اور موخر کو موخر ہی رکھا جائے۔ اور

مقدم کام ایک مسلمان کے لیے آخرت کا کام ہے، دنیا کا نہیں۔ اس کے لیے ایسی ذہنیت ایک لعنت ہے جو اسے یہ یاد ہی نہ آنے دے کہ وہ حیوان نہیں بلکہ انسان ہے، وہ اس دنیا میں تن پروری اور عیش کوشی کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اپنے پیدا کرنے والے کی بندگی اور رضا طلبی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے خود شناسی اور خدا طلبی کی جو سنتیں چھوڑی ہیں، اور جن کی تعلیم دی ہے، وہ تمام و کمال اسی مقصد کی خاطر تھیں۔ ان کے سچے متبعین نے اس مقصد کو جس طرح یاد رکھا اور ان کی سنت پر جس طرح عمل کیا، اس کا مثالی نمونہ حضرت مریم کی والدہ ماجدہ کے عمل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ حضرت مریم ابھی ان کے بطن پاک ہی میں تھیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَافِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ۔ (آل عمران - ۳۵)	اے میرے رب! میں نے اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کیا کہ وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف رہے، میری اس پیشکش کو قبول فرمالے۔

اس دعا میں اگرچہ یہ صراحت نہیں ہے کہ انھوں نے دعا ایک بیٹے کے عطا کیے جانے کی تھی بلکہ امر واقعہ یہی ہے، جس کا ثبوت بعد کے فقروں سے تو ملتا ہی ہے خود اس بات سے بھی ملتا ہے کہ اپنے ہونے والے بچے کو اللہ ہی کے کام کے لیے وقف کرنے کی نذر کر رہی تھیں، اور شریعت موسوی میں اللہ کے کام، یعنی مقدس کی خدمت کے لیے مرد ہی مقرر کیے جاسکتے تھے، اور یہ منصب انہی کے لیے مخصوص تھا، عورتیں اس خدمت پر مامور نہیں ہوسکتی تھیں۔ اس لیے حضرت مریم کی والدہ کا یہ کہنا کہ یہ بچہ مُحَرَّر (یعنی مقدس کی خدمت کے لیے وقف) ہوگا، قطعاً یہی معنی رکھتا تھا کہ خدایا! مجھے بیٹا عنایت فرما۔ یہ قریب قریب وہی بات تھی جو حضرت زکریا کی دعا میں تھی۔ یعنی اس درخواست کے وقت ان کی نظر اپنی کسی دنیوی ضرورت اور مصلحت کی طرف بالکل نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہرگز نہیں تھی کہ انھوں نے بیٹے کی آرزو کچھ اس طرح کی غرض سے کی ہو جس طرح کی غرض سے عام لوگوں کی ہوا کرتی ہے۔ کہ بیٹا زندگی کا سہارا

اور بڑھاپے کا عصا بنے گا۔ اس کے بخلاف انھوں نے خدا سے بیٹا خود اس دین کی خاطر مانگا تھا، صرف اس غرض سے مانگا تھا کہ اس کے ذریعہ مقدس کی خدمت انجام پائے، اللہ کے دین کو فروغ حاصل ہو اور دنیا میں حق کا اجالا پھیلے۔ ان کی اس پاک آرزو ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں جب بیٹے کی بجائے بیٹی پیدا ہوگئی تو اس پر وہ صرف اظہارِ حسرت ہی پر بس کرکے خاموش نہیں ہوگئیں بلکہ اب اسی پر صابر و شاکر ہوکر اسی بچی ہی کے لیے اس کے مومنہ صادقہ ثابت ہونے کی دعا کی طرف متوجہ ہوگئیں، اور اللہ تعالیٰ کے حضور عرض پرداز ہوکر بولیں کہ "میں نے اس کا نام مریم (پارسا اور پاک دامن) رکھا ہے، اور اسے اور اس کی اولاد کو شیطانِ مردود سے تیری پناہ میں دے رہی ہوں" (وَاِنِّیْ سَمَّیْتُھَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ آل عمران۔ ۳۶) اس گذارش کا مدعا جس طرح واضح ہے اسی طرح اس کے پیچھے کام کرنے والا جذبہ بھی واضح ہی ہے۔ مدعا یہ تھا کہ اس بچہ کی زندگی، اور صرف اس کی اپنی ہی زندگی نہیں، بلکہ اس کی آل اولاد کی زندگی بھی پاکیزگی کا نمونہ بنے اور شیطان کی دراندازیوں سے محفوظ رہے۔ یہ سب کے سب خدا کے سچے پرستار ہوں، ان کے ایمان و عمل کی باگیں نفس، دنیا اور شیطان کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں، تقویٰ اور طہارت ان کا شعار ہو، اور اللہ رب العالمین کی طاعت اور رضا طلبی ان کا وظیفۂ حیات ہو۔

حضرت مریم کی والدہ ماجدہ کا یہ طرزِ عمل یہ بتا دینے کے لیے بالکل کافی ہے کہ خدا اور اس کا دین ایک مسلمان سے اس کی اپنی اولاد کے بارے میں فی الواقع کیا چاہتا ہے؟ اس کے حق میں اس کی اصل ذمہ داری کس بات کو قرار دیتا ہے؟ وہ اس کو کیا بنانے کی ہدایت دیتا ہے؟ کون سا ذہن اور اندازِ فکر اس کے اندر پیدا کرنے کو کہتا ہے؟ کیسی تربیت دینے کی تاکید کرتا ہے؟ اور کس 'علم' کا 'ماہر' بنانے کی تلقین کرتا ہے؟

اہلِ ایمان کا ایک لازمی وصف

اولاد کے بارے میں ایک مسلمان کا یہی بنیادی فریضہ ہے تو جس کی بنا پر قرآن حکیم نے

'عباد الرحمن' (رحمان کے بندوں) کی ایک ضروری پہچان اور لازمی صفت یہ بتائی ہے کہ:

يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ لَنَا وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۔ (الفرقان۔۷۴)	وہ کہتے ہیں کہ مالک! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔

اس آیت کا اصل مدعا سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو تصریحات سامنے ضرور رکھنی چاہییں، ایک تو یہ کہ مومن کی آنکھوں کی اصل ٹھنڈک وہ باطنی کیف اور روحانی سرور ہے جو اسے نماز سے حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد مبارک ہے کہ:

جُعِلَتْ قرةُ عَيْنِي فِي الصلوة (احمد، نسائی)	میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

دوسری یہ کہ ہر فرد مسلم اپنے زیر اقتدار اور زیر اثر لوگوں اور چیزوں کا نگراں اور ذمہ دار ہوتا ہے:

أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالْأَمِيرُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ ... الخ۔	سن رکھو تم میں کا ہر شخص راعی (نگراں وذمہ دار) ہے، اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ لوگوں کے اوپر مقرر ہونے والا حکمراں ان کا راعی اور ذمہ دار ہے، اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں بازپرس ہوگی، اور مرد اپنے اہل وعیال کا راعی ہے، اور ان کی بابت اسے (اپنے خدا کے حضور میں جواب دہی کرنی ہوگی، ... الخ۔

(مسلم جلد دوم، کتاب الامارۃ)

ان ارشادات نبوی کی روشنی میں آیت کریمہ کا مدعا و مفہوم صاف طور سے یہ قرار پاتا ہے کہ 'عباد الرحمن' وہ لوگ ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں سچے مسلمان وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے زیر کفالت و زیر اثر اہل و عیال کو اس حال میں پانا اور دیکھنا چاہتے

'عباد الرحمن' (رحمان کے بندوں) کی ایک ضروری پہچان اور لازمی صفت یہ بتائی ہے کہ:

یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ (الفرقان-۷۴)	وہ کہتے ہیں کہ مالک! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔

اس آیت کا اصل مدعا سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو تصریحات سامنے ضرور رکھنی چاہییں: ایک تو یہ کہ مومن کی آنکھوں کی اصل ٹھنڈک وہ باطنی کیف اور روحانی سرور ہے جو اسے نماز سے حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد مبارک ہے کہ:

جُعِلَتْ قرۃُ عَيْنِيْ فِيْ الصلوۃ (احمد، نسائی)	میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

دوسری یہ کہ ہر فرد مسلم اپنے زیر اقتدار اور زیر اثر لوگوں اور چیزوں کا نگراں اور ذمہ دار ہوتا ہے:

اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ فَالْاَمِيْرُ الَّذِيْ عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَّهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُمْ ... الخ۔	سن رکھو تم میں کا ہر شخص راعی (نگراں و ذمہ دار) ہے، اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ لوگوں کے اوپر مقرر ہونے والا حکم راں ان کا راعی اور ذمہ دار ہے، اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں بازپرس ہوگی، اور مرد اپنے اہل وعیال کا راعی ہے، اور ان کی بابت اسے (اپنے خدا کے حضور میں جواب دہی کرنی ہوگی، ... الخ۔

(مسلم جلد دوم، کتاب الامارۃ)

ان ارشادات نبوی کی روشنی میں آیت کریمہ کا مدعا و مفہوم صاف طور سے یہ قرار پاتا ہے کہ 'عباد الرحمن' وہ لوگ ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں سچے مسلمان وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے زیر کفالت و زیر اثر اہل و عیال کو اس حال میں پانا اور دیکھنا چاہتے

رہیں جسے دیکھ کر ان کے دلوں کو کچھ ویسی ہی راحت محسوس ہو جو ایک مومن کو نماز سے ملا کرتی ہے، نہ کہ وہ جھوٹی ٹھنڈک، جو دنیا کی متاع بے ثبات سے اہل دنیا کو حاصل ہوا کرتی ہے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ افراد، جن کا وہ 'راعی' اور 'امام' ہے، تقویٰ کی صفت سے متصف ہوں، جن کے عقائد، جن کے افکار، جن کا نقطۂ نظر، جن کا کردار، جن کی گفتار، جن کی سیرت، جن کا اخلاق، جن کی پسند، جن کا مطلوب اور مقصود وہ ہو جو ان کے معبودِ برحق کی نگاہ میں پسندیدہ ہو، جس سے وہ خوش ہوتا ہو، اور جس کی اس نے ہدایت فرما رکھی ہو۔ ایسے ہی اہل و عیال اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتے ہیں، اور اسی شکل میں وہ 'متقیوں کا امام' ٹھہر سکتا ہے۔

اس وصف کی عملی شکل

اب تک کی بحث سے جو یہ اصولی حقیقت واضح ہوئی ہے کہ انبیاء اور ان کے سچے پیروؤں کی، اپنی اولاد کے بارے میں، اصل فکر کس بات کی رہتی ہے، اس کی عملی شکل اگر معلوم کرنی ہو تو قرآن کریم کی طرف رجوع کیجئے، جو آپ کو بتائے گا کہ لقمان نامی ایک سچے خدا پرست مومن و مسلم نے اپنے اس فریضے اور ذمہ داری کو ذرا تفصیل سے ادا کرنا چاہا تو اپنے بیٹے کو یوں نصیحت کی تھی :-

يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ..... يَا بُنَيَّ إِنَّهَا إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمٰوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ۔ يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ	بیٹا! اللہ کے ساتھ کسی کو (خدائی میں) شریک نہ کرنا، یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے ...... بیٹا! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر کا بھی ہو، پھر وہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں کہیں چھپا ہوا ہو، تب بھی اللہ اسے نکال لائے گا، وہ بڑا باریک بیں اور (ہر شے سے پوری طرح) باخبر ہے۔ بیٹا! نماز قائم رکھنا (لوگوں کو) نیکی کا امر کرتے

وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (لقمان - ١٣ - ١٩)

اور برائی سے روکتے رہنا، اور (اس راہ میں) جو مصیبت بھی تجھ پر پڑے اس پر صبر کرنا، بلا شبہ یہ بڑا عزیمت طلب کام ہے، اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کرنا نہ زمین پر اتراتے ہوئے چلنا۔ اللہ کسی خود پسند اور شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال ملحوظ رکھنا، اور اپنی آواز کو ذرا پست رکھنا۔ یقین جانو کہ سب آوازوں میں سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔

یہ حضرت لقمان بھی اُسی سنہری سلسلے کی ایک کڑی ہیں جو اپنے اہل و عیال کی صحیح ترین ذہن سازی اور تعلیم و تربیت کا مثالی نمونہ قائم کرتا رہا ہے، اس لیے اُن کی یہ نصیحت اور یہ تقریر، جو انھوں نے اپنے عزیز بیٹے کو مخاطب کر کے کی تھی، اللہ تعالیٰ کی اُس 'عبادت' اور دین کی 'اس خدمت' کی ایک مستند وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے جس کی ہدایت اور وصیت حضرات انبیاء کرام اور ان کے راست باز پیرو اپنی اولاد کو کرتے چلے آرہے ہیں، اور جس کا ہر صاحبِ ایمان مکلّف ہے۔ یہ تقریر جن بنیادی امور پر مشتمل ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی توحید پر گہرا اور واضح ایمان، (۲) آخرت کی جواب دہی کا سچا یقین (۳) نماز کی، جو در اصل پوری شریعت کا مغز و محور ہے، اقامت (۴) بندگانِ خدا کو معروف کی تلقین کرتے رہنا اور منکرات سے دور رکھنے کی جد و جہد دوسرے لفظوں میں حق کی شہادت اور دینِ خدا کی اقامت (۵) دین و ایمان کی راہ میں، بالخصوص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نتیجے میں پیش آنے والی مشکلوں، مخالفتوں، تکلیفوں اور نقصانوں پر صبر و استقامت (۶) تواضع اور انکسار (۷) سنجیدگی اور وقار۔

غور کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ 'عبادت' اور دین کی 'خدمت' کے یہ بنیادی امور پورے مجموعۂ دین و شریعت کو محیط ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں بنیادی ایمانیات

بھی ہیں، بنیادی[2] عبادت (نماز) بھی ہے، حق کی شہادت[3] اور دین کی اقامت کا فریضہ بھی ہے، اور بنیادی مکارمِ[4] اخلاق بھی ہیں۔ دین کے احکام و شرائع کا کوئی جزو ایسا نہیں ہو سکتا جو براہِ راست یا بالواسطہ، ان بنیادوں چیزوں کے اندر آ جاتا ہو۔ اس لیے حضرت لقمان کی اس نصیحت اور وصیت کا کھلا ہوا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہوئی ہر ہدایت کی تعمیل کی جائے۔ جو مسلمان بھی اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کا حق ادا کرنا چاہے ۔ اور اگر وہ مسلمان ہے تو اسے لازماً ایسا کرنا ہی چاہیے ۔ اس کے لیے، ان توضیحات کے بعد بھی کوئی بات مبہم یا مجمل نہیں رہ جاتی۔ اسے واضح طور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس نوع کی تعلیم و تربیت ہے؟ اس کے لیے اصل فکر کس بات کی رکھنی، اور اصل کوشش کس امر کی کرنی چاہیے؟ اور اس 'فکر' اور اس 'کوشش' کی عملی شکل کیا ہے؟

آخرت میں بازپرس

آخر میں اِس جانی جا چکی اہم حقیقت کو مزید نمایاں کر دینا مناسب، بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کے بارے میں مسلمان باپ کی یہ فکر اور یہ کوشش صرف ایک مستحسن کام اور ایک اخلاقی فضیلت کی بات نہیں ہے، حتیٰ کہ یہ صرف ایک ایمانی وصف بھی نہیں ہے، بلکہ ایسا ایمانی وصف ہے جس کی حیثیت ایک عظیم ذمہ داری اور ایک لازمی فریضے کی ہے، اور اس کے بارے میں اسے اللہ کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے گی۔ چنانچہ آپ ابھی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن چکے ہیں کہ "تم میں سے ہر شخص اپنے اہل و عیال کا 'راعی' اور نگراں و ذمہ دار ہی نہیں ہے بلکہ "هُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ" (وہ اپنی 'رعیت' کے تئیں خدا کے حضور میں مسئول اور جواب دہ بھی ہے) یہ مسئولیت اور یہ جواب دہی جو معنی رکھتی ہے اور خدا کی عدالت میں کی جانے والی یہ بازپرس جتنی سخت اور پریشان کن ہو سکتی ہے، اس کا تصور ایک حساس مسلمان کو ہلا کر رکھ دینے والا ہے۔ جس کے بعد وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا

انجام کیا ہو سکتا ہے ؟ پہلے سوال کا جواب اسلام کی ابتدائی تاریخ بڑی صراحت سے دے چکی ہے، اور دوسرے کا جواب بعد کی صدیوں کی تاریخ میں موجود ہے، اور سب سے واضح جواب اِدھر آخری دور کی اس تاریخ کی زبان سے سن لیا جا سکتا ہے جس میں ملتِ اسلامیہ پر مغرب کے استعمار ہی کا نہیں، اس کے تہذیبی افکار کا بھی زبردست غلبہ رہا ہے۔ اب اس کے سیاسی تسلط کی گرفت چاہے جتنی بھی ڈھیلی پڑ چکی ہو، لیکن جہاں تک اس کے فکری اور اقداری غلبہ و تسلط کا تعلق ہے، اس سے ملت کا جاں بر ہونا اب بھی مشکل بنا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اِکّا دُکّا افراد ہی اپنی اس ذمہ داری کو فراموش کر بیٹھے ہوں تب بھی بحیثیت مجموعی ملت کے حال و مستقبل پر اس کا کوئی ناگوار اثر مرتب نہیں ہو سکتا، لیکن خدانخواستہ یہ وبا عام ہو گئی ہو تو اسے ملت کی اسلامیت کے لیے اجل کا پیغام ہی کہا جا سکتا ہے۔ آج صورتِ واقعہ کیا ہے، اس کا جائزہ لینا ہر مسلمان کا فرض ہے، اور خاص طور سے ان مسلمانوں کا تو 'فرضِ عین' ہے جو کسی بچے یا کچھ بچوں کے باپ ہوں اور جن کی امانت میں مشیت نے دین و ملت کے نونہال دے رکھے ہوں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظوں میں یہ کہ جو کسی 'اہلِ بیت' کے 'راعی' بنائے جا چکے ہوں۔

فارم ۱۷

رسالہ "تحقیقات اسلامی" علی گڑھ

۱۔ مقام اشاعت : علی گڑھ

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳۔ نام پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر : سید جلال الدین عمری

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ

۴۔ نام اور پتہ مالک رسالہ : ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی پان والی کوٹھی، دودھ پور، علیگڑھ

میں سید جلال الدین عمری تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں

دستخط :-

سید جلال الدین عمری

۱۸ر فروری ۱۹۸۲ء

تصوّرِ مساوات کا پس منظر

جناب سلطان احمد اصلاحی

انسانی زندگی میں کچھ قدریں ہمیشہ سے ایسی رہی ہیں جنھیں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اور ان کے حصول کو انسان اپنی زندگی کے اہم ترین مقاصد میں شمار کرتا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کی متمدن دنیا میں ان کا تذکرہ کچھ زیادہ شد و مد کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور فضا میں ہر طرف ان کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر امن، آزادی، اجتماعی عدل اور بنیادی حقوق وغیرہ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں یہ اور ان جیسی دوسری اقدار کی حیثیت مسلمات کی سی ہوگئی ہے کہ متمدن دنیا کا ہر شخص بالفعل تسلیم کرتا اور ان کی وکالت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ عوامی سطح پر بھی ان اقدار کا برابر چرچا رہتا ہے اور حکومت کے ایوانوں میں بھی ہر جگہ ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ موجودہ دنیا کی انہی مسلمہ اقدار میں مساوات کا بھی شمار ہوتا ہے۔ مساوات کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے سارے انسان چونکہ پیدائشی طور پر یکساں ہیں اس لئے انھیں یکساں حقوق و اختیارات بھی حاصل ہونے چاہئیں۔ مساوات کے ساتھ عام طور پر آزادی اور اخوت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ 'مساوات' کے ساتھ ان کا ربط اتنا گہرا ہے کہ ان کے بغیر مساوات کے تصور کی تکمیل نہیں ہوتی۔

امریکہ کی آزادی کا منشور حالیہ دور میں ریاستی سطح پر ان اقدار کا تذکرہ سب سے پہلے ہمیں امریکہ کے ۴ جولائی ۱۷۷۶ء کے آزادی کے اعلامیہ (AMERICAN DECLAR-ATION OF INDEPENDENCE) میں ملتا ہے جس میں اس چیز کو ایک بدیہی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا کہ:۔

"سارے انسان یکساں پیدا کئے گئے ہیں اور اپنے خالق کی طرف سے انھیں

کچھ حقوق عطا کئے گئے ہیں جو غیر منفک ہیں، مثال کے طور پر زندگی، آزادی اور خوشی کی تحصیل وغیرہ [۵]

اس مرحلے پر جن لوگوں نے اس تصور کی حمایت کی ان میں جان آدمس، JOHN-ADAMS ٹامس جفرسن THOMAS JEFFERSON اور ٹامس پین THOMAS PAINE کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یورپ میں تصورِ مساوات کا عہد بہ عہد ارتقاء ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی برطانوی استعمار سے آزادی اور اس کے ساتھ آزادی کا یہ اعلامیہ دراصل نقطۂ عروج تھا آزادی و مساوات کے اس تصور کا جس کے تھوڑے بہت نشانات ہمیں یورپ میں رومن امپائر کے دور سے ہی ملتے ہیں۔ رومی قانون میں رواقی فلسفے (STOICISM) کے زیر سایہ انسانوں کی آزادی اور اخوت و مساوات کے تصورات پہلے ہی سے موجود تھے۔ اس کے بعد رومن امپائر میں دو عناصر مزید شامل ہوئے۔ ایک طرف مسیحیت آئی اور دوسری طرف ٹیوٹانی اقوام (TEUTONIC-NATIONS) کا اضافہ ہوا اور یہ دونوں بھی انسانوں کی آزادی اور ان کی مساوات کے قائل تھے۔ جہاں تک مسیحیت کا سوال ہے تو اس کی بنیاد ہی اس حقیقت پر تھی کہ مسیح کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ اور انسانی زندگی میں اصل اہمیت فرد کی ہے جیسا کہ عہد نامہ جدید میں ہے:

"نہ کوئی یہودی رہا نہ یونانی، نہ کوئی غلام نہ آزاد، نہ کوئی مرد نہ عورت، کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو۔" (گلتیوں کے نام پولس رسول کا خط باب ۳، ۲۸، ۲۹) [۶]

چنانچہ اس زمانہ میں مسیحی مبلغین (FATHERS) عام طور پر اس کا درس دیا کرتے تھے کہ فطرت کے لحاظ سے سارے انسان آزاد اور برابر ہیں۔ رہیں ٹیوٹانی اقوام جنہوں نے رومن امپائر کا تختہ الٹ کر اس میں ایک نئے خون کا اضافہ کیا تو چونکہ یہ جنگ جو اقوام تھیں اس لئے ان کے اندر فطری طور پر آزادی و خودمختاری کے تصورات نہ صرف یہ کہ موجزن تھے بلکہ وہ اس کی علمبردار بھی تھیں

---

[۵] Chamber's Encyclopaedia Vol VI London 1874 - (Liberty, Equality, Fratenity P. 113)

[۶] عہد نامہ جدید صفحہ ۲۵۳ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی۔ انارکلی لاہور ۱۹۱۶ء

چنانچہ ان کے نزدیک شخصی آزادی کو غیر معمولی قدر و قیمت حاصل تھی۔ یہ لوگ فرد کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اور کسی آزاد انسان کی آزادی میں دخل اندازی کو روا نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے زیرِ اقتدار حکومت کے جن اداروں کی تشکیل ہوئی وہ بھی شخصی آزادی اور شخصی حقوق کے تصور کی عکاسی کرنے والے تھے۔

اس کے بعد کی یورپ کی تاریخ جاگیرداری بادشاہت اور مسیحی استبداد کی تاریخ ہے۔ جس میں آزادی و مساوات کے نقوش اس قدر مدھم ہیں کہ انھیں نہ ہونے کے برابر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس پورے عرصے میں یورپ کی آبادی دو طبقوں میں منقسم رہی۔ ایک طرف جاگیردار، بادشاہ اور کلیسا جو اپنی حکمرانی کا سکہ جمائے ہوئے تھے۔ اور دوسری طرف محکوم عوام، جن کی اس دنیا ہی کی نہیں بلکہ دوسری دنیا کی نجات بھی اس سے وابستہ تھی کہ وہ بلا چون و چرا اپنے حکمرانوں کی اطاعت کرتے چلے جائیں۔ اور آزادی و مساوات اور دوسرے انسانی حقوق کی آواز کبھی بھولے سے بھی اپنی زبان پر نہ لائیں۔ معاملات کی یہ رفتار معمولی تغیرات کے ساتھ سولہویں اور سترہویں صدی کے عرصے تک جاری رہتی ہے۔ جبکہ جاگیرداری، شاہی اور اس کے ساتھ ہی کلیسائی نظام کی بساط الٹ کر جمہوریت آزادی اور مساوات انسانی کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ سرزمین یورپ کی حکمران اور عوام کی کشمکش کی یہ داستان اپنا ایک طویل سلسلہ رکھتی ہے۔ جس کا آغاز پانچویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے پانچویں صدی عیسوی میں رومن امپائر کے زوال کے بعد یورپ چھوٹی چھوٹی جاگیرداریوں میں منقسم ہوگیا۔ جس کی آپس کی آویزشوں، معاشی ابتری اور امن و امان کی بدتر صورتحال سے عاجز آکر اور اس کے ساتھ ہی مسیحیت کی عطا کردہ اس پیاس کے زیرِ سایہ کہ روئے زمین پر ایک عالمی کلیسا (WORLD CHURCH) - اور ایک عالمی شہنشاہیت کی حکومت ہونی چاہئے۔ دسویں صدی عیسوی میں ہولی رومن امپائر کے نام سے رومن امپائر کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ جسے بالآخر جاگیرداروں (FEUDALS) - اور رئیسوں (NOBLES) کے بڑھتے ہوئے اثرات کے باعث ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ رومن امپائر کے آغاز سے لیکر اس پورے عرصے میں کلیسا اور پاپائیت کو حکومت کے اوپر غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل رہا۔ لیکن گیارہویں اور بارہویں صدی میں جب جاگیرداری نظام کو مزید استحکام حاصل ہوا تو اس کے ساتھ کلیسا کے اقتدار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ اور

پوپ دونوں ایک دوسرے کے مد مقابل آکھڑے ہوئے۔ جس میں بالآخر فتح کلیسا کو نصیب ہوئی، اس کے بعد آہستہ آہستہ جاگیرداری کا زوال شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کلیسا کے اثرات بھی کم ہونا شروع ہوئے۔ اس صورت حال نے جاگیرداری کی جگہ قومی بادشاہتوں (NATIONAL MONAR - CHIES) کو جنم دیا۔ ان قومی بادشاہتوں کی راہ روکنے کی خاطر سماج کے سربرآوردہ طبقات (PRIV - ILEGED CLASSES) نے عوام الناس کے ساتھ ملکر شاہی اقتدار پر روک لگانی چاہی، اور عوام کو آزادی کا حق عطا کرنا چاہا۔ چنانچہ ۱۲۱۵ء میں برطانیہ میں MAGNA CARTA کی صورت میں عوام کو جزوی طور پر ان کی آزادیوں کی ضمانت عطا کی گئی

اس مرحلے پر یورپ میں شہروں اور ان میں بسنے والے تجارت پیشہ طبقات کو سماج کے اندر اتنی اہمیت حاصل ہو چکی تھی کہ اب انھیں نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ ان حالات کا رخ دیکھ کر کلیسا پھر قومی بادشاہتوں کا حلیف بن گیا۔ اور ان کے ساتھ مل کر عوام کا اسطرح استحصال شروع کیا کہ ان کی لوٹ کھسوٹ کو دیکھ کر خود کلیسا سے بھی نہ رہا گیا۔ چنانچہ اس کے بطن سے سولہویں صدی کی پروٹسٹنٹ رفارمیشن (PROTESTANT REFORMATION) کی تحریک پیدا ہوئی پروٹسٹنٹ تحریک نے کلیسا کا زور توڑنے کے لئے قومی بادشاہتوں کا ساتھ دیا۔ اور اس مقصد کی تکمیل کی خاطر 'انسانی مساوات' کا نعرہ بلند کیا۔ فوری طور پر اگرچہ یہ چیز ریاستوں کے استحکام کا سبب بنی جس کے زیر سایہ کلیسا پھر مسند اقتدار پر متمکن ہو گیا۔ لیکن بالآخر یہ چیز فرد کی آزادی اور جمہوریت کی لہر کو تیز تر کرنے کا پیش خیمہ بنی۔ اب گویا بادشاہ اور عوام کے درمیان ٹکر کے لئے اسٹیج تیار ہو چکا تھا۔

اس وقت سے لے کر اٹھارویں صدی کے اختتام تک اگرچہ یورپ میں ہمیں ایک طبقہ اس خیال کا حامی نظر آتا ہے کہ "بادشاہ اپنے ابدی حق کی وجہ سے حکومت کرتے ہیں" 'Kings are ruled by divine right' — نیز یہ کہ عوام کا منصب بس اپنے حکمراں کی خاموش اطاعت (PASSIVE OBEDIENCE) ہے۔ لیکن اس کی مخالف لہر دن بدن زور پکڑتی گئی کہ سارے انسان برابر (EQUAL) ہیں ہر انسان کے کچھ فطری حقوق (NATURAL RIGHTS) ہیں اور عوام اور حکمراں کا رشتہ حاکم و محکوم کا نہیں بلکہ ایک سماجی معاہدے (SOCIAL CONTRACT) کا رشتہ ہے۔ جس کے تحت ہر ایک پر کچھ ذمہ داریاں

اور کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں۔ یہ خیالات ہمیں چودہویں اور پندرہویں صدی کے مفکرین کے یہاں بھی ملتے ہیں مثال کے طور پر جان وائی کلف (JOHN WYCLIF 13-20-1384) جان ہس (JOHN HUSS 1369-1415) اور نکولس آف کیوز (NICHOLOS OF CUES 1401-1464) وغیرہ۔ لیکن سولہویں صدی سے لیکر اٹھارویں صدی کے عرصے میں یہ آواز مزید گھن گرج کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ جس کے سلسلے میں خاص طور پر ٹامس ہابس (THOMAS HOBBES 1588-1679) جان لاک (JOHN LOCKE 1632-1704) بنیڈکٹ اسپنوزا (BENEDICT SPI-NOZA 1632-1677) جین جیکس روسو (JEAN JACQUES ROUSSEAV-1712-1787) کلینڈ ہیلوٹیس (CLANDE HELVETIUS 1715-1771) اور فرانسیسی قاموس نگار ڈیڈروٹ (DIDEROT 1713-1784) اور ڈی البرٹ (D. ALEMBERT 1717-1783) وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ برطانیہ میں ان تصورات کی جھلک جزوی طور پر '1215 MAGNA CARTA' کے بعد ۱۶۲۸ء کے PETITION OF RIGHTS اور اس کے بعد بالترتیب ۱۶۷۹ء اور ۱۶۸۹ء کے HABEAS CORPUS ACT اور 'BILL OF RIGHTS' کی دستاویزات میں دکھائی دیتی ہے لیکن اس کا کامل ترین مظہر ۱۷۷۶ء کا امریکہ کی آزادی کا وہ اعلامیہ ہے جس کا حوالہ اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ جس کی صدائے بازگشت اس کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کے موقعہ پر (DECLARATION OF THE RIGHTS OF MAN AND OF CITIZEN) کی صورت میں ہمیں سنائی دیتی ہے۔[۲]

---

[۱] یہ تمام معلومات لارنس سی۔ ونلاس LAWRENC C. WANLASS کی کتاب 'HISTORY OF POLITICAL THOUGHT' سے ماخوذ ہیں البتہ اس سلسلے میں سنین کا اضافہ کہیں کہیں ہم نے الگ سے کر دیا ہے۔

[۲] اس سلسلے میں ہم انسانی حقوق (HUMAN RIGHTS) سے متعلق اقوام متحدہ (U.N.O) کی دسمبر ۱۹۴۶ء اور دسمبر ۱۹۶۵ء وغیرہ کی قراردادوں کا حوالہ نہیں دے رہے ہیں کہ دراصل یہ وہی پرانی شراب ہے جو نئے جام میں پیش کی گئی ہے۔ (س)

اس تصور کے نقائص اور اس کے مخالف تصورات سرزمین یورپ سے اٹھنے والا آزادی و مساوات کا یہ تصور اپنے اندر جو نقائص رکھتا ہے اسے بادنیٰ تامل محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ آزادی و مساوات کا کوئی آفاقی تصور نہیں، جو اپنی کوئی واقعی بنیادیں رکھتا ہو۔ اور پھر اس کے نتیجے میں آفاقیت کا علمبردار کوئی معاشرہ وجود میں آیا ہو۔ اس کے برعکس یہ چیز وہاں کے مخصوص حالات کی پیداوار ہے۔ اور حکمراں اور عوام کی کشمکش کے بطن سے وجود میں آئی ہے۔ اس لئے اس کا نہ کبھی کوئی آفاقی کردار رہا ہے اور نہ تو اس سے اس کی توقع رکھی جانی چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں مسیحیت نے اسے آفاقی رنگ دینا چاہا، لیکن چند قدم سے زیادہ وہ اپنی یہ حیثیت برقرار نہ رکھ سکی۔ اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ رہی.......... کہ اس کے ساتھ ہی یورپ میں کچھ ایسے تصورات و نظریات پیدا ہوئے جنھوں نے آزادی و مساوات کے اس دھندلے تصور کو بھی خاک میں ملا دیا۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ نظریات تصور مساوات کے عین ضد تھے اور بالکلیہ اس کی نفی کرنے والے تھے، ہماری مراد فاشزم، ریشزم، اور بالشوزم وغیرہ کے تصورات سے ہے۔ اس لئے کہ ان کے اندر فرد کی شخصیت کو ریاست کے اندر گم کر دیا گیا تھا اور اس کے لئے منتہائے کمال اسے قرار دیا گیا تھا کہ وہ ریاست کے حق میں اپنے جملہ حقوق و مطالبات سے دستبردار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوسرے انسانی حقوق کی طرح آزادی و مساوات کی قدروں کی پامالی بھی یقینی تھی، جس طرح مساوات کا مذکورہ تصور ارتقاء کی ایک طویل منزل طے کرنے کے بعد اپنے آخری مقام تک پہنچا تھا، مساوات کے مخالف یہ تصورات بھی اپنے ارتقاء کی ایک داستان رکھتے ہیں، جس کا آغاز جرمن آئیڈیلزم سے ہوتا ہے۔

جرمن آئیڈیلزم انقلاب فرانس کے بعد یورپ میں جو حالات رونما ہوئے اور جس کے نتیجے میں مغرب میں لادینیت اور انفرادیت پسندی (INDIVIDUALISM) کے رجحانات پیدا ہوئے۔ مذہبی طبقے اور سوسائٹی کے متوسط طبقات کی طرف سے اس کے خلاف جو ردعمل ہوا فاشزم (FACISM) اس کا مظہر تھا، جس کے خاص مراکز جرمنی اور اٹلی رہے ہے۔ اس تصور کی ابتداء 'جرمن مثالیت' (GERMAN IDEALISM) کی صورت میں ہوئی جس میں افلاطون اور ارسطو کے خیالات کی پیروی کرتے ہوئے 'فرد' کو 'ریاست' میں گم کر دیا گیا تھا۔ اور جس کے اندر آزادروی کے مقابلے میں خود عائد کردہ پابندی (SELF-IMPOSED DUTY) کو اور عقل کے مقابلے میں جذبات کو کلیدی اہمیت دی گئی تھی

اس تصور کی بنیاد رکھنے والوں میں کانٹ IMMANUEL KANT (1724-1804)، جان فشٹ (1762-1814) JOHANN FICHTE اور ہیگل GEORGE WILHELM HEGEL (1770-1831) کا نام سرفہرست ہے۔ خاص طور پر ہیگل جسے کہ فاشزم کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

ان مفکرین نے اپنے سیاسی اصولوں کی بنیاد تجربہ و مشاہدہ کے مقابلے میں خالص فکر 'PURE-THOUGHT' کے اصول پر رکھی اور سیاسیات میں باطنی امنگ (WILL) کے تصور کو سب سے انتہائی عنصر قرار دیا۔ انھوں نے اپنی فکر کا آغاز تو انقلاب فرانس کے آزادپسند اور آفاقی تصورات سے کیا لیکن بعد میں اس کی مخالف سمت میں ترقی کرتے گئے جس کا منشا اپنی قومی ریاست کی عظمت (GLORIFICATION) اور جرمن قوم کے لازوال مشن میں ایک توہماتی یقین تھا جیسا کہ ظاہر ہے مثالیت کے اس تصور کے عین مزاج کا اقتضا ہے کہ انسانی زندگی میں آزادی کی قدروں کو کوئی مقام حاصل نہ رہے۔ اصل چیز 'ریاست' اور اس کی 'عظمت' ہے اور اس کے بالمقابل فرد کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسے اس عظمت کے حصول کے لئے بطور آلہ کار کے استعمال کیا جائے۔ اس کے بعد کلیت پسندی کا یہ قافلہ ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور رومانویت کی صورت اختیار کرتا ہے۔

رومانٹسزم (ROMATECISM) فاشزم کے ارتقائی مرحلے کی یہ دوسری منزل ہے اور اپنی پیدائش کے لئے انقلاب فرانس کے خلاف یورپ کے اسی فلسفیانہ ردعمل کی رہین منت ہے۔ اس تصور نے اپنے ماننے والوں کے اندر اکابر پرستی کا بیج بویا اور اپنی قوم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ کسی مخصوص قسمت کی مالک ہے۔ اور زندگی کے اسٹیج پر اسے کوئی خصوصی کردار ادا کرنا ہے۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنی مشترک قومی اصلوں (ORIGINS) پر بیش از بیش فخر کرنے لگے۔ اور ان کے اندر مخصوص طور پر اپنی قوم کی برتری کا احساس بڑھتا گیا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نئے سرے سے اپنی تاریخ میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ اور سیاسی مسائل کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا۔

نیشنلزم آگے جب یہ لہر کچھ اور تیز ہوئی تو اس نے نیشنلزم یعنی قومیت پرستی کی صورت اختیار کی جس کا سہرا بھی جرمنی ہی کے دو مفکروں ٹریٹسکی HEIN VON TREITSCHKE

(1834-1896) FRIEDRICH KARAL VON SAVIGNY اور سیوگنی
(1779-1861) کے سربند تھا ہے جسے صحیح تر لفظوں میں جارحانہ قوم پرستی ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ٹریٹسکی کا کہنا تھا کہ جرمنی کو چاہئے کہ اپنی طبعی حدود کو یوں ہی خالی پڑا نہ رہنے دے اسی طرح اسے اپنی آبادی کے مختلف عناصر کو ایک وحدت میں ضم کر لینا چاہئے اور اپنی تہذیب کے دائرے کو پست اقوام تک وسیع کر دینا چاہئے۔ خواہ اس کے لئے جنگ ہی کی ضرورت کیوں نہ ہو۔ ٹریٹسکی اپنی تصنیفات کے ذریعہ مسلسل اس بات کی تلقین کرتا رہا کہ ریاست کی تعمیر میں جو طریقۂ کار اور جو تدابیر بھی اختیار کی جائیں سب حق بجانب ہیں۔ اس راہ میں ریاست اپنے شہریوں کی قربانی بھی دے سکتی ہے۔ اور دوسری قوموں کو بھی قربانی کی بھینٹ چڑھا سکتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک مضبوط ریاست ہی جرمنی کی تہذیب کا تحفظ کر سکتی اور اس کے عوام کے لئے مضبوطی اور اتحاد قائم کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے سامعین کو جرمنی کی تاریخی عظمت کا درس دیتا اور انھیں اس بات کی خوش خبری سناتا کہ اعلیٰ قسمت (EXALTED DESTINY) اس کی چشم براہ ہے۔

یہی خیالات سیوگنی کے بھی تھے۔ اس کا اصرار تھا کہ اپنے افراد کے مقابلے میں ریاست کی زندگی کو بالاتری حاصل ہونی چاہئے۔ اپنے ان خیالات کے ذریعہ اس نے اس رجحان کو تقویت دی جس کے نتیجے میں کامل کلیت پسندی (ABSOLUTISM) کا پیدا ہونا یقینی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عوام کو ذرا بھی سیاسی اقتدار نہیں سنا چاہئے۔ یہاں تک کہ انھیں ریاست کے تحت منظم کر دیا جائے۔ جس کی بدولت ہی ان کے لئے اپنی شخصیت اور اپنے اقتدارِ اعلیٰ کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا کہنا تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کسی ایک نسل میں مرتکز نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ریاست اپنی جلو میں بہت سی نسلوں کو سمیٹے ہوتی ہے جس کا تعلق ماضی کی نسلوں سے بھی ہوتا ہے اور ان سے بھی جو ابھی پیدا نہیں ہوئی ہیں۔ ریاست کی تشکیل کسی قوم (NATION) کی تاریخ اور اس کی زندگی سے ہوتی ہے۔ یہ دراصل ایک ایسی تخلیقی قوت کا نتیجہ ہوتا ہے جو اندر ہی اندر کام کرتی رہتی ہے۔

ریشنزم | اس کے بعد فاشزم کے ارتقائی مرحلے نے ریشنزم (RACISM)

یعنی نسل پرستی کی صورت اختیار کی جس نے یورپ کے ایجاد کردہ تصور مساوات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور حقیقت یہ ہے کہ فاشزم کے مختلف پہلوؤں میں کسی دوسرے نظریے کے اتنے انقلابی نتائج نہیں رہے جتنے کہ نسلی برتری (RACIAL SUPERIORITY) کے اس تصور کے رہے جیسے ارتھر ڈی گوبینو (ARTHUR DE GOBINEAU (1816-1882) اور ہیوسٹن اسٹیورٹ چیمبرلن (HOUSTON STEWART CHAMBERLIAN (1855-1926) نے پیش کیا۔ یہ اسی تصور کا نتیجہ تھا کہ جرمنی میں لاکھوں یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یا انھیں خانماں برباد دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کردیا گیا۔

گوبینو جو اس مکتب خیال کا بانی تھا۔ ایک سائنس داں کی بہ نسبت شاعر زیادہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک نئی سائنس' ایجاد کرنے سے باز نہ رہا جس کا مرکزی نکتہ' انسانی نسلوں کی عدم مساوات' تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نوع انسانی کو تین متمایز نسلوں (DISTINCT RACES) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ نیگرو، چینی اور یورپین، اس کے خیال میں ہر نسل کی کچھ امتیازی خصوصیات ہیں اور انہی خصوصیات کی نسبت سے وہ دوسروں سے برتر یا ان سے کمتر ہے۔ ذہن و دماغ (INTELLECT) کے لحاظ سے نیگرو سب سے پست اور یورپین سب سے فائق ہیں۔ ہاں آرٹ اور موسیقی کی صلاحیت میں نگرو آگے ہیں۔ چینیوں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ عملی زیادہ ہوتے ہیں اور ان کے اندر قانون کی پابندی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ البتہ ان کے اندر بڑے لیڈر اور بڑے دماغ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں۔ اس کے خیال کے مطابق سفید فام لوگ عقل (REASON) قوت کار (ENERGY) اور قابلیت (RESOUCEFULNESS) اور تخلیقیت (CREATIVENESS) میں زیادہ مالدار ہیں۔ اگرچہ ان میں تمام لوگ یکساں عالی دماغ اور صاحب صلاحیت نہیں ہوتے ہیں مثال کے طور پر سامی اقوام (SEMITES) دوسرے سفید فام طبقات کے مقابلے میں کمزور صلاحیت کی مالک ہوتی ہیں اس لئے کہ یہ لوگ دراصل سفید فام اور سیاہ فام دونوں نسلوں کا مرکب (COMBINATION) ہیں۔ سفید فام طبقات میں سب سے عمدہ اور خالص آریہ نسل ہے جو جرمنی اور انگلینڈ میں پائی جاتی ہے اور جس کے بقایا بھی فرانس کے نوابوں کے یہاں ملتے ہیں۔ گوبینو کے خیال کے مطابق اپنی نسل کو کامل طور پر بے آمیز رکھنا تو شاید ممکن نہ ہو سکے۔

لیکن موجودہ صورت میں گھٹیا نسلوں کے خون کی کثافت سے آرین نسل برباد ہوئی جاتی ہے، اس کا خیال تھا کہ اگر یہ عمل (PROCESS) جاری رہا تو یورپین تہذیب کا مستقبل خطرے میں پڑ جائیگا۔

چیمبرلن جو اپنی پیدائش کے لحاظ سے تو برطانوی تھا لیکن بعد میں جرمن شہریت اختیار کر لی تھی، اس نے جرمنی میں ان خیالات کی خوب تشہیر کی گوبینو کی طرح اس نے بھی یہی استدلال پیش کیا کہ انسانی نسلیں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے باہم اتنی ہی مختلف ہیں جتنی کہ جانوروں کی نسلیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ انسانی نسلیں اپنے عادات و اطوار میں درحقیقت اتنی ہی مختلف ہوتی ہیں جتنی کہ مختلف نسلوں کے کتے۔ مثال کے طور پر تازی کتا، بڑے سر والا کتا، گھونگھرے بالوں والا کتا اور اسپانیل کتا جو ترکی میں مشہور ہے۔ آریائی نسل اور خاص طور پر اس نسل کا ٹیوٹانی طبقہ دوسری تمام نسلوں سے "بنیادی خصوصیات" میں فائق تر ہے۔ اس لئے کہ آرٹ، فلسفہ، مذہب اور سیاسیات کے میدانوں میں تمام تر ترقیاں اسی کی رہین منت ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ٹیوٹانی خون ہی دراصل انسانی تہذیب کی جان ہے۔ اپنے ارد گرد کا مشاہدہ ہمارے سامنے یہ گواہی پیش کرے گا کہ کسی قوم (NATION) کی اہمیت کا انحصار اس حقیقت پر ہے کہ وہ اپنے آبادی میں ٹیوٹانی خون کس تناسب (PROPORTION) سے رکھتی ہے۔ اس کے خیال میں سب سے زیادہ ٹیوٹانی خون جس قوم کے اندر ہے وہ جرمن قوم ہے۔ جرمن آبادی کو اس سلسلے میں وہ فوقیت حاصل ہے کہ اس کے ذریعہ ایک شاہ نسل (MASTER RACE) تشکیل پاتی ہے جس کی قسمت میں پہلے سے لکھا ہوا ہے کہ اسے آنے والی بہت سی صدیوں تک دنیا کی تہذیبی اور سیاسی قیادت کا فرض انجام دینا ہے۔

فاشزم کا انتہائی مرحلہ آزادی و مساوات کی اعلیٰ انسانی قدروں کی بیخ کنی کرنے والے فاشزم کے اس تصور نے دنیائے انسانیت کو تباہی و بربادی کے کس الاؤ میں جھونکا ہے، اس کو دیکھنے کے لئے ہمیں فاشزم کے انتہائی مرحلے پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ یہ ۱۹۲۲ء کا زمانہ جب فاشزم کا تصور اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے اس کے سیاسی کردار کا آغاز ہوتا ہے۔ اب تک فاشزم کا تصور جن شکلوں میں نمودار ہوا تھا، وہ کچھ کم خوفناک نہ تھیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد اس کی خوفناکی اپنی آخری انتہا کو پہنچ گئی

روس کے اس سرخ انقلاب کو دیکھ کر اٹلی اور جرمنی کے صاحب ثروت طبقے کے کان کھڑے ہوگئے اور ان کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ اور ان کے سفید فام متوسط طبقوں (MIDDLE-CLASSES) کے اندر خوف وہراس کی فضا پھیل گئی۔ اس خطرے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس سے بہتر کوئی موقعہ نہ تھا کہ فاشزم کے اسلحے کو استعمال کیا جائے۔ جبکہ حالات کے اس رخ نے اسے مزید دھاردار کردیا تھا۔ یہی پس منظر تھا جب اٹلی میں مسولینی - BENITS MUSSOLINI (1883 - 1945) - اور جرمن میں ہٹلر - ADOLF HITLER (1889-1945) منصۂ شہود پر آئے جن کے ہاتھوں فاشزم کی انتہا پسندی اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ اور آزادی و مساوات کی اعلیٰ انسانی قدروں کو تو چھوڑیئے، خود انسانیت کے حق زیست کے لالے پڑ گئے۔

فاشزم کے ان علمبرداروں نے ایک طرف تو اپنی قوم کے اندر اپنی نسلی برتری (RACIAL - SUPERIORITY) - کے احساس کو مزید تقویت دی۔ اور اس طرح اپنی قوم کے اندر ایک طرح کے جنون کی کیفیت پیدا کردی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ریاست کے حقوق ایسا بڑھا چڑھا کر پیش کئے کہ اس کے بالمقابل فرد کی شخصیت بالکل گم ہوکر رہ گئی۔ چنانچہ یہ نعرہ دیا گیا کہ "تاریخ کے باہر آدمی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔" (OUTSIDE HISTORY MAN IS NOTHING) نیز آزادی ایک حق نہیں بلکہ ایک ڈیوٹی ہے - (LIBERTY IS NOT A RIGHT BUT - A DUTY) - اور "آزادی کی کوئی حقیقت نہیں سوائے اس آزادی کے جو ریاست فراہم کرتی ہے - (THERE IS NO LIBERTY BUT THE LIBERTY WHICH - IS INHERENT IN THE STATE) - اسی طرح قوم (NATION) کے سلسلے میں یہ کہا گیا کہ تمام چیزیں اور اشخاص قوم کے تابع ہیں۔ اور ریاست ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انھیں اپنے وجود کا تشخص ملتا ہے۔ قوم کے سلسلے میں بیشک افراد کی ذمہ داریاں ہیں لیکن قوم اپنے معاملے میں کسی کی پابند نہیں۔ اسی طرح ریاست کے بالمقابل فرد کی حیثیت یہ بیان کی گئی کہ "ریاست کے دائرے میں رہ کر ہی فرد اپنی شخصیت کا اظہار (REALIZE) کرسکتا ہے، ہر چیز ریاست کے اندر، ریاست کے خلاف کچھ نہیں اور ریاست کے باہر کچھ نہیں۔ - (EVERY-

THING WITHIN THE STATE, NOTHING AGAINST THE -STATE, NOTHING OUTSIDE THE STATE)

اگر ایک طرف مسولینی نے ریاست کا یہ غالی تصور پیش کیا تو دوسری طرف ہٹلر نے اپنی قوم جرمن کے لئے شاہ نسل (MASTER RACE) ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور دنیا کی دوسری تمام نسلوں کو اس کے مقابلے میں فروتر قرار دیا۔ یہ اسی نسل برتری کا نتیجہ تھا کہ تمام سچے نازیوں کے لئے یہودیوں کو ان کا مشترک دشمن (COMMON ENEMY) قرار دیا گیا۔ اور پوری یہودی قوم کو یا تو ملک بدر کر دیا گیا یا انھیں بالکل تہس نہس کر دیا گیا۔ اور جب برطانیہ و امریکہ سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی تو اسے اس قدر احمقانہ حرکت تصور کیا گیا جس کی تردید کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی جرمنی میں یہ نعرہ لگایا جانے لگا کہ "ایک عوام، ایک نظام، ایک حکمراں (ONE PEOPLE, ONE RCICH, ONE FURHER) - اور پھر جرمنی سے یہ چیخ بلند ہوئی کہ "ہم اپنے خون سے سوچتے ہیں - (WE - THINK WITH OUR BLOOD) - اور اپنے سربراہ ہٹلر کو ناقابل خطا (INFALLIBLE) قرار دیا گیا۔

یہ اسی فاشزم کے تصور کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف ہٹلر اور مسولینی نے اپنے اندرون ملک اپوزیشن کا خاتمہ کیا۔ اور پھر دنیا کی دوسری قوموں کو اپنے لئے کھلی چراگاہ تصور کرتے ہوئے عظیم اٹلی اور عظیم جرمنی کے اپنے خواب کی تعبیر کے لئے اسی جنون کے ساتھ میدان میں نکل آئے جس کے منحوس اثرات دنیائے انسانیت کے سامنے جنگ عظیم ثانی کی صورت میں نمودار ہوئے جس کے اندر آزادیٔ اقوام اور انسانی مساوات کی اعلیٰ قدروں کو تو چھوڑئیے، انسانیت کے حق زیست کے تصور کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی گئیں۔

بالشوزم سرزمین یورپ سے اٹھنے والے ان فاشسٹ تصورات کی فہرست نامکمل رہے گی اگر اس میں بالشوزم کو شامل نہ کیا جائے۔ جسے شوشلزم اور کمیونزم کے دوسرے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کی امتیازی حیثیت، انسانوں کی معاشی فلاح کے ایک انقلابی تصور کو حاصل ہے۔ اور اپنی اس حیثیت میں وہ دنیا کے کمزور انسانوں کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے

والا اور اپنے تئیں ان کا نجات دہندہ ہونے کا مدعی بھی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے اوپر فاشسٹ تصور کی چھاپ اتنی گہری ہے اور اپنے اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ جس فکر اور جس طریقۂ کار کا قائل ہے، اس کے پیش نظر اس کے اس غالب عنصر کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے متعلق کوئی گفتگو کرنا سچ یہ ہے کہ اس کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے۔ ...... کمیونزم کا مقصد ایک غیر طبقاتی سماج (CLASS LESS - SOCIETY) کا قیام ہے جس کے اندر سارے انسان یکساں ہوں۔ اور غریبی اور امیری کے فاصلوں کو یکسر مٹا دیا گیا ہو۔ پیداوار کے ذرائع پر تمام انسانوں کو یکساں مالکانہ حقوق حاصل ہوں۔ اور چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کمیونزم دو کلیدی اصول پیش کرتا ہے (۱) طبقاتی جنگ اور (۲) پرولتاریہ کی انقلابی ڈکٹیٹرشپ۔ کہنے کو یہ بات کتنی اچھی ہے کہ سماج سے طبقہ واریت کا خاتمہ ہو جائے، سارے انسان برابر (EQUAL) ہو جائیں اور ان کے درمیان 'من و تو' کا کوئی امتیاز نہ رہے۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ جس جبر و تشدد اور توڑ پھوڑ کا قائل ہے۔ اور اس کے لئے مزدور نمائندوں کی جس مطلق العنان حکومت کا تصور یہ پیش کرتا ہے، جسے وہ پرولتاریہ کی انقلابی ڈکٹیٹرشپ' کا نام دیتا ہے۔ اس کے پیش نظر اگر اسے 'مزدور طبقات کے فاشزم' (LABOU-R - CLASS FACISM) کا نام دیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ کمیونزم اس سلسلے میں جس انتہا پسندی کا شکار ہے اس کا اندازہ کمیونسٹ مینیفسٹو کے ان آخری فقروں سے لگایا جا سکتا ہے :-

> "کمیونسٹ اپنے خیالات اور اپنے عزائم کو چھپانے کو اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھتے ہیں۔ وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے کو بالکلیہ بجبر اکھاڑ پھینکا جائے۔ حکمراں طبقات کو چاہئے کہ وہ کمیونسٹ انقلاب کے امکانات کو دیکھ کر کانپ اٹھیں۔ مزدوروں کے پاس سوائے اپنی زنجیروں کے کھونے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ انھیں تو ایک دنیا فتح کرنی ہے۔ دنیا کے مزدورو! متحد ہو جاؤ" [لہ]

لہ Manifesto of the Communist party P.98-99 Foreign Languages publishing House Moscow 1949.

کمیونزم کی اس انتہا پسندی کا اندازہ لینن (۱۹۲۴ - ۱۸۷۰) کے ان الفاظ سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

"ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصور پر مبنی ہو۔ یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو جو طبقاتی تصورات سے ماوراء ہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کے لئے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب مضبوط اور منظم ہوں۔ اور نفع گیر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں۔ ہم یہ مانتے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی وابدی اصول بھی ہیں۔ ہم اس فریب کا پردہ چاک کرکے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کی مطلق العنان حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے"۔

"ناگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال، فریب، غیر قانونی تدبیر، حیلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے"۔[۱]

جب اس نظریئے کے صف اول کے حاملین کے یہ تیور اور ان کا یہ لب ولہجہ ہے تو پھر ان کے عام پیرووں کے اندر غیر مزدور طبقات کے لئے بغض وحسد اور نفرت وعداوت کے جو جذبات کارفرما ہوں گے اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ عقل کہتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ دستوری یقین دہانیوں کے باوجود ایسے کسی طبقے کی طرف سے عام ابنائے انسانیت کے سلسلے میں عدل وانصاف اور آزادی ومساوات کی روش پر قائم رہنا ناممکن ہے۔ ماضی قریب میں سودیت روس کے اشتراکی انقلاب اور اس کے بعد اس کے پڑوسی ملکوں رومانیہ، بلغاریہ، پولینڈ اور چیکوسلواکیہ وغیرہ اور اب تازہ افغانستان میں اس نظریئے کے علمبرداروں کی طرف سے عام انسانوں کے سلسلے میں ظلم وبربریت کا جو مظاہرہ کیا گیا اور آگ وخون کی جو ہولی کھیلی گئی اور جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے وہ اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔

---

[۱] اسلام اور جدید معاشی نظریات / ۶۹

[۲] یہ تمام معلومات بھی لارنس سی وئلاس کی کتاب مذکور 'History of Political Thought' اور ڈی۔ آر بھنڈاری کی کتاب History of European Political Philosphy سے ماخوذ ہیں۔

کم زور کے مسائل اسلام نے حل کئے ہیں

سید جلال الدین عمری

پروپیگنڈہ میں بڑی تاثیر ہے۔ اس سے ایسی فضا بن جاتی ہے کہ اس کے خلاف سوچنا مشکل ہوتا ہے۔ بولنا تو اور بھی مشکل ہے۔ لیکن پروپیگنڈہ سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ کسی غلط بات کو صبح و شام دہرایا جائے تو بعض اوقات اچھے خاصے معقول اور سمجھ دار آدمی بھی دھوکا کھا جاتے ہیں اور اس کی صحت پر یقین کر بیٹھتے ہیں، لیکن اس سے کوئی غلط بات صحیح نہیں بن جاتی۔ غلط غلط ہی ہے، چاہے اس کے حق میں پوری دنیا چیخنے چلانے ہی کیوں نہ لگ جائے۔ صحیح اپنی جگہ صحیح ہے، چاہے اس کی تائید میں ایک آواز بھی نہ اٹھے۔ مذہب کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ پہلے بھی بڑے زور شور سے ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا رہتا ہے کہ وہ سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے، طاقت ور کا دوست اور حلیف ہے، کم زور کے استحصال اور اس کو غلام بنائے رکھنے کا ذریعہ ہے۔ مذہب ایک افیون ہے یا اسے مارفیا کا انجکشن کہیے جو کم زور کو اس لئے لگایا جاتا ہے، تاکہ اس کے جسم کا رہا سہا خون بھی اس طرح چوس لیا جائے کہ اس کو اس کا احساس تک نہ ہو۔ اور جو شخص پہلے ہی سے خوب تنومند اور طاقت ور ہے وہ اب کچھ اور موٹا تازہ اور فربہ ہو کر مزید خون آشامی کرتا پھرے۔

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں۔ اسلام کو بھی ان ہی مذاہب میں سے ایک مذہب سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر ایک بات عرض کر دینی مناسب ہوگی۔ وہ یہ کہ اسلام عام معنی میں مذہب نہیں ہے بلکہ وہ ایک دین ہے جو پوری زندگی پر خدا کی حکومت چاہتا ہے۔ بہر حال غلطی یا شرارت سے مذہب پر اعتراض کیا جاتا ہے تو اسلام بھی بڑی

آسانی سے اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ یہاں ماضی سے بحث نہیں کم از کم اس وقت اصل ہدف اسلام ہی ہے۔ اگر ضمناً دوسرے مذاہب بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں تو اس میں پروپیگنڈہ کرنے والے کا کوئی نقصان نہیں ہے بلکہ، فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اسلام کو خاص طور سے نشانہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مذاہب میں اسلام ہی سب سے زیادہ جاندار اور طاقتور مذہب ہے۔ اپنے ماننے والوں پر اس کی گرفت جتنی مضبوط ہے اتنی کسی دوسرے مذہب کی نہیں ہے۔ اس کے اندر ایک نئے انقلاب کی جتنی قوت اور صلاحیت ہے وہ کسی دوسرے مذہب یا فلسفے میں نہیں ہے، اس لئے اسلام کو اگر کسی محاذ پر شکست دے دی جائے تو دوسرے مذاہب کے قدم آسانی سے اکھڑ جائیں گے۔

مذاہب عالم کے بارے میں لکھنے والے کی معلومات بہت محدود ہیں اس لئے اسے ان کی ترجمانی یا دفاع کا حق نہیں ہے، البتہ اسلام کے ایک ادنی طالب علم کی حیثیت سے وہ یہ عرض کرنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ مذکورہ بالا پروپیگنڈہ ایک الزام ہے۔ الزام تراشی کے لئے بھی کوئی نہ کوئی بنیاد تلاش کر لی جاتی ہے اور رائی کا پہاڑ بنالیا جاتا ہے لیکن ڈھونڈے سے بھی اس کی کوئی بنیاد اسلام میں نہیں ملتی۔ بے بنیاد الزام کا اسے شاہکار کہا جاسکتا ہے۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں اسلام کو کمزور کا ایجنٹ نہیں بلکہ اس کا وکیل کہوں گا۔ وکیل کا لفظ کچھ بدنام سا ہو گیا ہے۔ وکیل ہر کل کی وکالت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اسے اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ صحیح بات کی وکالت کر رہا ہے یا غلط بات کی۔ بلکہ شاید کامیاب وکیل وہی سمجھا جاتا ہے جو جھوٹ کو سچ اور ظالم کو مظلوم ثابت کردے اور غلط مقدمہ کی بھی اس طرح پیروی کرے کہ حق والا آہ و فغاں کرتے ہوئے اور حق مارنے والا مسرت اور خوشی کے شادیانے بجاتے ہوئے لوٹے۔ اسلام نے کمزور کی وکالت کی تو کسی غلط مقدمہ کی نہیں کی بلکہ ایک صحیح اور جائز کیس کی وکالت کی اور اس طرح کی کہ آج تک اس کے حق میں جو کچھ کہا جاتا ہے یا آئندہ کہا جاسکتا ہے سب اسی

صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

اسلام کمزور کا وکیل ہی نہیں اس کے حقوق کا محافظ اور نگہبان بھی ہے۔ کمزور کا دنیا میں کوئی حق نہیں تھا۔ وہ دوسروں کے رحم وکرم پر جیتا تھا۔ جیتا کیا تھا یہ سوچ کر زندگی کا طمار رہتا تھا کہ موت کے بعد چین کی نیند سو جائے گا۔ اس کے جسم وجان دونوں عذاب میں مبتلا تھے۔ اس پر جو بھی ظلم کیا جاتا دنیا کی کسی عدالت میں اس کی شنوائی نہیں تھی۔ اس کا وجود سب کی خدمت اور راحت کے لئے تھا لیکن خود اس کے لئے یہاں راحت کا کوئی سامان نہیں تھا۔ سماج میں اس کی حیثیت اس قدر گرگئی تھی کہ وہ اپنے وجود ہی پر شرم بلکہ نفرت اور گھن محسوس کرتا۔ یہ اس کا ماضی تھا۔ اس کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ہاں کمزور اور اس کے مسائل کا چرچا اس قدر بڑھ گیا ہے کہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اب اس کے برے دن پھر جائیں گے اور اس کے دکھ درد کا مداوا ہوگا اور وہ ایک نئی اور تابناک زندگی کا آغاز کرے گا۔ لیکن یہ ابھی ایک خواب ہے۔ کمزور کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا، اس کی حمایت کا دم بھرنا، اس کے حقوق کے لئے نعرے لگانا، اس کی تائید میں خطبات اور مقالات پڑھنا، لیکچر دینا اور وعظ کرنا آسان ہے۔ اس کے لئے کسی محنت، قربانی بلکہ سنجیدہ فیصلہ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کس وناکس بلکہ ہر بوالہوس اس کا سہرا اپنے سر بندھوانا چاہتا ہے۔ بلکہ اس خدمتِ بابرکت کو کمزور کے دشمن بھی اس شان سے اور ایسے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ انجام دیتے ہیں کہ بے چارہ کمزور اپنی سادہ لوحی میں ان کو اپنا ہی خواہ اور ہمدرد سمجھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کمزور کے مسائل نہ حل ہوئے ہیں اور نہ حل ہوں گے۔ وہ معاشی، سیاسی، سماجی معاشرتی اور علمی واخلاقی لحاظ سے جہاں وہ کل تھا آج بھی وہیں ہے اور آئندہ بھی وہیں رہے گا۔ اور اس کا استحصال کرنے اور لوٹنے والے بھیس بدل بدل کر نت نئے ناموں سے اور جدید سے جدید تر ہتھیاروں سے لیس ہوکر اسے لوٹتے اور استحصال کرتے رہیں گے۔

اسلام نے کمزور کو اس کے چھنے ہوئے حقوق دئے، اس پر ہونے والی

ظلم وزیادتی کا خاتمہ کیا۔ اس کے اندر جرأت و ہمت اور استقلال پیدا کیا، اور اسے باعزت اور باوقار زندگی عطا کی۔ اسلام اس کے لئے ایک ابر رحمت تھا۔ اس سے اس کے تن مردہ میں جان آئی اور اس کی سوکھی کھیتی لہلہا اٹھی۔ اسے وہ سکون اور راحت ملی جس کا تصور بھی وہ آسانی سے نہیں کر پا رہا تھا۔

پیغمبر خوش حال اور حکمراں طبقے سے نہیں ہوتے

دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے پیغمبر آئے، ہر دور اور ہر زمانہ میں آئے۔ ان کا کردار بے داغ اور ان کی سیرت آئینہ کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ ان کے اخلاق پر کسی نے کوئی داغ دھبہ نہیں دیکھا۔ ان کے جانی دشمنوں نے بھی ان کی رفعت اخلاق کا اعتراف کیا۔ ان کا تعلق شریف اور باعزت قبائل سے تھا اور وہ خود بھی پورے سماج میں شریف اور معزز سمجھے جاتے تھے۔ لیکن معاشی اور اقتصادی پہلو سے ان کی کوئی امتیازی حیثیت نہیں تھی۔ ان کا تعلق آسودہ حال اور عیش پسند گروہ سے نہ تھا وہ متوسط یا غریب طبقہ سے بھیجے جاتے تھے اور ان کی زندگی عیش و عشرت سے پاک ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دین کی طرف بلایا تو عرب کے سرداروں نے کہا:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (الزخرف: ۳۱)

یہ قرآن دونوں بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا۔

حضرت موسیٰؑ کو دیکھ کر فرعون نے کہا:

فَلَوْلَا اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝ (الزخرف)

(اگر یہ خدا کا رسول ہے تو) اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں پہنائے گئے یا اس کی اردلی میں فرشتوں کا دستہ کیوں نہیں آیا۔

پیغمبروں کا خطاب عام ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کے جتنے پیغمبر اس دنیا میں آئے ہیں سب نے، قرآن مجید کی رو سے اسلام

ہی کی دعوت دی، یہ دعوت بالکل عام ہوتی۔ وہ جس قوم میں آتے اس کے ہر فرد اور ہر طبقہ سے ان کا خطاب ہوتا۔ خوش حال افراد سے بھی بدحال لوگوں سے بھی، حکمرانوں سے بھی، زیردستوں اور محکوموں سے بھی۔ ان کی دعوت ہر طرح کے طبقاتی کشمکش سے پاک ہوتی۔ وہ کسی کے ساتھ نہ تعصب برتتے اور نہ بے جا حمایت کرتے۔ وہ سب کی ہدایت کے طالب ہوتے اور سب کو راہ راست پر دیکھنا چاہتے تھے۔

کمزور طبقات پیغمبروں کا ساتھ دیتے ہیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے ہر دور میں جن افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ معاشرہ کے کمزور افراد تھے اور جن طبقات نے ان کی آواز پر لبیک کہا وہ بھی معاشرہ کے کم زور طبقات تھے۔ جو لوگ عیش وعشرت کے دل دادہ اور آسائش و راحت کے مارے ہوئے تھے، جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار اور حکومت کی باگ ڈور تھی، انہوں نے بالعموم اس کی طرف رخ نہیں کیا بلکہ اس کی شدید مزاحمت اور بدترین مخالفت کی۔ اس سے وہ سعید روحیں مستثنیٰ ہیں جن سے دنیا کا کوئی بھی طبقہ خالی نہیں ہوتا۔ بلاشبہ انھوں نے ہر طرح کی زنجیریں توڑ دیں اور سب کچھ قربان کر کے اسلام کا ساتھ دیا۔ یہاں ایک عمومی رویہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ قرآن میں ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ (السبا: ۳۴-۳۵)

ہم نے جس بستی میں بھی اپنا کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے آسودہ حال لوگوں نے کہا کہ جو پیغام تم لائے ہو ہم اسے ماننے والے نہیں ہیں ہم تم سے زیادہ مال، اولاد رکھتے ہیں اور ہمیں ہرگز سزا نہیں دی جائے گی۔

ارباب اقتدار کے اس رویہ کے مختلف اسباب ہیں۔ ایک تو ان کا یہ غرور ہے کہ دنیا کی ساری سوجھ بوجھ ان ہی کو حاصل ہے۔ وہ خود کو عقل کل اور دوسروں کو بے وقوف اور نادان سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اپنی دانائی اور فہم و بصیرت اور دوسروں کی نادانی اور

ہی کی دعوت دی، یہ دعوت بالکل عام ہوتی۔ وہ جس قوم میں آتے اس کے ہر فرد اور ہر طبقہ سے ان کا خطاب ہوتا۔ خوش حال افراد سے بھی بدحال لوگوں سے بھی، حکمرانوں سے بھی، زیردستوں اور محکوموں سے بھی۔ ان کی دعوت ہر طرح کے طبقاتی کشمکش سے پاک ہوتی۔ وہ کسی کے ساتھ نہ تعصب برتتے اور نہ بے جا حمایت کرتے۔ وہ سب کی ہدایت کے طالب ہوتے اور سب کو راہ راست پر دیکھنا چاہتے تھے۔

کمزور طبقات پیغمبروں کا ساتھ دیتے ہیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے ہر دور میں جن افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ معاشرہ کے کمزور افراد تھے اور جن طبقات نے ان کی آواز پر لبیک کہا وہ بھی معاشرہ کے کم زور طبقات تھے۔ جو لوگ عیش و عشرت کے دل دادہ اور آسائش و راحت کے مارے ہوئے تھے، دنیا کے ہاتھ میں زمام اقتدار اور حکومت کی باگ ڈور تھی، انھوں نے بالعموم اس کی طرف رخ نہیں کیا بلکہ اس کی شدید مزاحمت اور بدترین مخالفت کی۔ اس سے وہ سعید روحیں مستثنیٰ ہیں جن سے دنیا کا کوئی بھی طبقہ خالی نہیں ہوتا۔ بلاشبہ انھوں نے ہر طرح کی زنجیریں توڑ دیں اور سب کچھ قربان کر کے اسلام کا ساتھ دیا۔ یہاں ایک عمومی رویہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ قرآن میں ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ (السبا: ۳۴، ۳۵)

ہم نے جس بستی میں بھی ایسا کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے آسودہ حال لوگوں نے کہا کہ جو پیغام تم لائے ہو ہم اسے ماننے والے نہیں ہیں ہم تم سے زیادہ مال، اولاد رکھتے ہیں اور ہمیں ہرگز سزا نہیں دی جائے گی۔

ارباب اقتدار کے اس رویہ کے مختلف اسباب ہیں۔ ایک تو ان کا یہ غرور ہے کہ دنیا کی ساری سوجھ بوجھ ان ہی کو حاصل ہے۔ وہ خود کو عقل کل اور دوسروں کو بے وقوف اور نادان سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اپنی دانائی اور فہم و بصیرت اور دوسروں کی نادانی اور

اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَکٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُکُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰہُ خَیْرًا۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ اِنِّیْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ (ہود: ۲۹-۳۰)

آتی ہوا ور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں اور یہ بھی میں نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انہیں اللہ کسی بھلائی سے نہیں نوازیگا۔ اللہ انکے نفس کا حال خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔

کمزوروں نے ہی آخری پیغمبر کا ساتھ دیا

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ بھی زیادہ تر کمزوروں ہی نے دیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ حضرت ابوسفیانؓ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ہرقل نے ان سے پوچھا:

فاشرف الناس یتبعونه ام ضعفائهم؟

قوم کے شرفاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کررہے ہیں یا اسکے ضعفاء اور کمزور؟

حضرت ابوسفیانؓ نے جواب دیا۔

بل ضعفاءهم

قوم کے کمزور لوگ انکا ساتھ دے رہے ہیں

ہمارے ایک قدیم مورخ ابن اسحٰق نے زیادہ واضح الفاظ میں ابوسفیانؓ کا بیان نقل کیا ہے۔

تبعه منا الضعفاء والمساکین فامّا ذو الانساب والشرف فما تبعه منهم احد [1]

ہم میں جو ضعیف اور مسکین ہیں وہ انکا ساتھ دے رہے ہیں باقی رہے حسب نسب اور عزت وشرف والے تو ان میں سے کوئی انکا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

---

[1] فتح الباری ۱/۲۶۔

یہ سن کر ہرقل نے جواب دیا۔

وھم اتباع الرسل [1]	رسولوں کی اتباع کرنے والے یہی کمزور ہوتے ہیں۔

علامہ ابن کثیر جن کا مفسر اور مورخ دونوں حیثیتوں سے بڑا اونچا مقام ہے۔ فرماتے ہیں۔

کان غالب من اتبعہ فی اول بعثتہ ضعفاء الناس من الرجال والنساء والاماء فلم یتبعہ من الاشراف الا قلیل [2]	بعثت کے شروع میں زیادہ تر کمزور مردوں، عورتوں، غلاموں اور لونڈیوں نے آپ کا ساتھ دیا۔ اونچے لوگوں میں سے آپ پر ایمان لانے والے بہت تھوڑے تھے۔

قریش کے سرداروں اور سرمایہ داروں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین صحیح اور سچا ہے تو آن بے چارے ضعفاء اور مساکین کے حصہ میں کیسے چلا جائے گا اور ہم اس سے کس طرح بے بہرہ رہ جائیں گے؟ وہ سمجھتے تھے کہ دین دنیا کی بھلائی تو ہماری قسمت میں لکھی گئی ہے اور حکمت و دانائی ہمارے باپ دادا کی میراث ہے، اس لئے اگر اس دعوت میں خیر ہوتا تو ناممکن تھا کہ ہم پیچھے رہ جاتے اور معاشرے کے بدقسمت افراد آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیتے۔ قرآن کے الفاظ میں:

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَا الیہ (الاحقاف: ۱۰)	اگر اس میں خیر ہوتا تو اس معاملہ میں یہ لوگ ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔

کبھی کہتے اگر خیر ان کے ساتھ ہے تو یہ فقر و فاقہ اور مصیبت میں کیوں گرفتار ہیں، کیوں ان کی حالت بہتر نہیں ہوتی۔ کیا ہماری موجودہ حیثیت اس بات کی شہادت نہیں دیتی کہ عقل و دانش ہمارے ساتھ ہے اور ہم حق پر ہیں۔ اور ان بے چاروں نے نادانی اور بے وقوفی کی راہ اختیار کر رکھی ہے۔ ارشاد ہے،

---

[1] بخاری، کتاب الوحی۔ [2] تفسیر ابن کثیر ۲ / ۱۵۳۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا۔ (مریم: ۷۳)	جب ان کو ہماری بالکل واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ دونوں فریقوں میں سے کون مال و منال کے لحاظ سے بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلس شاندار ہے۔

قریش کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت خبابؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت زیدؓ جیسے غلاموں اور محکوموں کو دیکھا تو آپؐ سے کہا کہ یہ ہیں آپ کے ساتھی۔ کیا پوری قوم میں سے یہی آپ کو ملے، کیا انہیں پر اللہ کا احسان ہوا ہے؟ کیا اس سرمایہ سے آپ خوش اور مطمئن ہیں؟ اگر آپ ان کو ہٹا دیں تو ہم آپ کی بات سن سکتے ہیں اور غور کر سکتے ہیں؛ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ایسا آپ کر کے دیکھ لیں کہ فی الواقع کیا نتیجہ نکلتا ہے[1] لیکن قرآن تو کمزوروں اور ضعیفوں کو سینے سے لگانے آیا تھا۔ اس نے حکم دیا۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنْۢ	جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر ہے۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر

---

[1] ملاحظہ ہو، ابن کثیر ۲/- المنار ۷/۴۳۳

بَيْنِنَا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۔ (الانعام: ۵۲-۵۳)

کہیں کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل وکرم ہوا ہے۔ ہاں! کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (الکہف: ۲۸)

اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھو (انکی رفاقت اور معیت پر مطمئن رہو) جو اپنے رب کو اسکی رضا کی طلب میں صبح وشام پکارتے ہیں تمہاری آنکھیں حیاتِ دنیا کی زیب وزینت کی تلاش میں ان سے ہٹنے نہ پائیں تم اس شخص کی بات نہ مانو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے، جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔

اس طرح سماج کے جو کمزور افراد اور طبقات اسلام کی طرف کھنچ کر آ رہے تھے اسلام ان کو عزت و احترام کے ساتھ آگے بڑھ کر لے رہا تھا۔ وہ ان کمزوروں اور مظلوموں کو ان جبابرۂ قریش کے مقابلہ میں عزت اور رفعت دے رہا تھا اور انہیں اپنا سرمایہ سمجھ رہا تھا جن کے سر حق و صداقت کے سامنے جھکنے کے لئے تیار نہیں تھے البتہ حق و صداقت کو اپنی ہوا و ہوس کا تابع دیکھنا چاہ رہے تھے۔

اسلام نے کمزوروں کے مسائل حل کرنے کے لئے ہمہ جہتی اقدام کیا، اسی نے ان کے مسائل کا صحیح اور واضح تصور دیا۔ ان کی حقیقی کمزوریوں کی رعایت کی، ان کے اندر عزم و حوصلہ پیدا کیا، انہیں جد وجہد پر ابھارا، اس کے ساتھ معاشرہ کو ان کی خدمت کی ترغیب دی اور انہیں قانونی تحفظات عطا کئے۔ یہاں ان ہی پہلوؤں کی تھوڑی سی وضاحت کی جائے گی۔

کمزور کے مسائل کا وسیع تصور

کم زور اور اس کے مسائل سے ہر طرف بحث جاری ہے اور انہیں حل کرنے کی تدبیریں اور کوششیں بھی برابر ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ ساری کوششیں اس کے ایک معاشی مسئلہ کے گرد گھومتی ہیں۔ خیال یہ کیا جاتا ہے کہ کم زور کا مسئلہ صرف اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔ یا یہ کہ اصل مسئلہ معاشی مسئلہ ہے۔ باقی سارے مسائل اس کے تابع ہیں۔ یہ اگر حل ہو جائے تو اس کے تمام مسائل از خود حل ہو جائیں گے۔ لیکن یہ کم زور کے مسائل کا بلکہ کسی بھی انسان کے مسائل کا بہت محدود تصور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معاشی مسئلہ کی بڑی اہمیت ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان نرا معاشی حیوان نہیں ہے کہ چارہ پانی پاکر آسودہ و مطمئن ہو جائے اور اس کی کمیت و کیفیت جتنی بہتر ہو اس کی آسودگی بڑھتی چلی جائے۔ غذا، لباس، مکان، تعلیم، دوا علاج کا تعلق براہِ راست معاش سے ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ یہی اس کے کل مسائل ہیں۔ یہ اگر حل ہو جائیں تو وہ ہر پہلو سے بالکل مستغنی اور بے نیاز ہو جائے گا اور کسی طرح کی مدد کی اسے حاجت نہ ہوگی۔ کم زور کی کمزوری ایک ہی طرح کی نہیں ہوتی۔ وہ معاشی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی، علمی اور فکری، جسمانی اور مادی اخلاقی اور روحانی کسی طرح کی ہوتی اور ہو سکتی ہے۔ معاش سے انسان کے بعض مادی مسائل کا تعلق ہے۔ کل مسائل کا نہیں۔ معاشی حالت کے بہتر ہونے سے اس کے سارے مسائل حل نہیں ہو جاتے۔ جو شخص بھوکا، ننگا اور مالی مدد کا محتاج ہے یقیناً اس کا مسئلہ معاشی ہے۔ لیکن جو شخص مال و دولت رکھتے ہوئے بھی کسی ناقابلِ علاج بیماری میں گرفتار ہو اس کا مسئلہ معاشی نہیں نفسیاتی ہے۔ وہ روپیہ پیسہ نہیں روحانی سکون چاہتا ہے۔ دولت دنیا سے مالا مال ہونے کے باوجود جس عورت کا اپنی بھرپور جوانی میں اچانک سہاگ لٹ جائے وہ معاشرہ میں تحفظ، عزت اور وقار چاہتی ہے۔ اسی طرح جس شخص کو دولت نے عیاشی اور آوارگی میں مبتلا کر دیا ہو اس کی کمزوری معاشی

نہیں اخلاق ہے۔ اسے کھانے کپڑے کی نہیں اصلاح و تربیت کی ضرورت ہے۔ اسلام کی نظر انسان کی ہر طرح کی کمزوریوں پر ہے اور وہ ان سب کا علاج کرتا ہے۔ وہ مسکینوں اور محتاجوں کی معاشی ضرورت پوری کرتا ہے، مزدوروں اور محکوموں کے مسائل حل کرتا ہے، بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرتا اور قرض داروں کی مدد کرتا ہے، عورتوں، بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی کرتا اور سماج میں انہیں اونچا مقام عطا کرتا ہے، بیماروں، معذوروں، ضعیفوں، مصیبت زدوں اور آفت کے مارے ہوؤں کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کرتا اور ان کے دکھوں کا مداوا کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جس شخص کو جس طرح کی وقتی اور ہنگامی یا مستقل اور دیرپا، چھوٹی یا بڑی، مادی یا اخلاقی مدد کی ضرورت ہو وہ فراہم کی جائے تاکہ کوئی بھی فرد کسی بھی مرحلہ میں خود کو بے یار و مددگار محسوس کرے اور معاشرہ میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکے۔

کمزور افراد اور طبقات دونوں کی مدد

آج پوری دنیا کمزور اور طاقت ور قوموں میں بٹ گئی ہے۔ جن قوموں کے پاس طاقت اور اقتدار ہے وہ کمزور قوموں کا بری طرح استحصال کر رہی ہیں۔ پھر ہر قوم اور ملک میں کمزور اور طاقت ور طبقات دونوں ہی موجود ہیں ان میں سے طاقت ور طبقات کمزور طبقات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور انہیں ان کے بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ دونوں طبقات ایک دوسرے کے حریف بن چکے ہیں اور ان کے درمیان ملکی و قومی اور بعض اوقات بین الاقوامی سطح پر شدید کشمکش برپا ہے۔ ان کے مسائل بھی اب طبقاتی اور گروہی مسائل بن گئے ہیں۔ اسی حیثیت سے ان کے بارے میں سوچا بھی جاتا ہے۔ اس طرح مسئلہ کمزور افراد کا نہیں کمزور جماعتوں کا بن گیا ہے۔ لیکن اس طرح سوچنے میں دو اہم حقیقتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جن طبقات کو ہم آسودہ حال اور مطمئن سمجھتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں بھی ایسے افراد ہوں جو ہماری ہمدردی کے محتاج ہوں۔ اسی طرح جن طبقات کو ہم کمزور کہتے ہیں ان میں . . . .

بھی خوش حال افراد ہوسکتے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے افراد یقیناً ہوتے ہیں۔ اگر ہم طبقات کی اصلاح میں سوچیں اور عمل کریں تو بسا اوقات کم زور افراد کی طرف ہماری توجہ نہیں ہوتی اور وہ اس تعاون سے محروم رہتے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے سامنے انسان کی صرف معاشی کم زوری ہی نہ ہو بلکہ کمزوری کا وسیع تصور ہو تو محسوس ہوگا کہ دنیا کا ہر آدمی دوسرے کی مدد کا محتاج ہے۔ چاہے کسی بھی طبقہ سے اس کا تعلق کیوں نہ ہو۔ مرض، رنج وغم، معذوری، ضعف، بڑھاپا اور جانی ومالی صدمات سے کون نہیں دوچار ہوتا اور ان سب صورتوں میں کون اخلاقی یا قانونی مدد کا محتاج نہیں ہوتا؟

اسلام کسی بھی قوم کے استحصال کو جائز نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ کم زور کو کم زوری حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اور اسے جس وقت جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو وہ فراہم کرتا ہے۔

کمزور کی کمزری کی رعایت

اسلام نے کم زور کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کا تعلق خود اس کی ذات سے بھی ہے۔ معاشرہ سے بھی اور ریاست سے بھی۔

مذہب کے نام کے ساتھ پوجا پاٹ، ریاضت ومشقت اور رسم ورواج کی بندشوں اور صعوبتوں کا تصور ابھرنے لگتا ہے اور آدمی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ مذہب اس کی اصلاح وتربیت اور اس کے دکھ درد کا علاج ہے یا تہذیبِ نفس اور روحانی کلفت کا سامان۔ اس کی جانِ ناتواں اور کم زور جسم دنیا کے بوجھ کے ساتھ مذہب کا بوجھ بھی اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟ پھر وہ مایوسی کے بعد، کبھی اسے بدنصیبی سمجھ کر اور بیشتر حالات میں خوش بختی تصور کر کے مذہب کا جوا اتار کر رکھ دیتا ہے اور ہر بندش سے آزاد ہو کر دنیا کے جھمیلوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اگر مذہب کی بندشوں کو توڑنے کی ہمت نہ کرے تو دنیا کے چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسلام نے دین اور مذہب کے نام پر جو بے جا سختیاں تھی انہیں ختم کیا۔ قرآن مجید اپنے لانے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خاص وصف ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ (الاعراف: ۱۵۷)	ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نازل کرنے والا انتہائی حکیم و دانا اور بڑا ہی رحیم و کریم ہے۔ وہ انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں سے بھی واقف ہے اور اس کی کمزوریوں، مجبوریوں اور ناتوانائیوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کی تعلیمات مرد اور عورت، جوان اور بوڑھے، عالم اور جاہل، حاکم اور محکوم، امیر اور غریب، مزدور اور مالک، مریض اور تندرست، مسافر اور مقیم سب کے لئے ہیں اور سب کی رعایت اس میں کی گئی ہے۔

ذمہ داری بقدر استطاعت

اسلام میں ذمہ داریوں کی بنیاد استطاعت پر ہے جس شخص کے اندر جتنی طاقت ہے اتنی ہی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اور جو چیز اس کی استطاعت سے باہر ہے وہ اس کی ذمہ داری سے بھی خارج سمجھی گئی ہے۔ قرآن بڑی صراحت کے ساتھ کہتا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ: ۲۸۶)	اللہ کسی جان پر اس کی استطاعت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

وسعت اور گنجائش اور طاقت اور امکان میں فرق ہے۔ ایک شخص ہو سکتا ہے کہ سو پچاس کلو کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر پانچ سات کلو میٹر چلا جائے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب کہ وہ اپنی پوری توانائی صرف کر دے بہت ممکن ہے اس سے اس کی کمر ٹوٹ جائے اور وہ مزید بوجھ اٹھانے کے قابل ہی نہ رہ جائے۔ اسے وسعت نہیں کہا

جانا۔ وسعت یہ ہے کہ آدمی کسی کام کو بہ سہولت کر سکے اور اسے انجام دینے میں اسے غیر معمولی زحمت اور مشقت نہ اٹھانی پڑے۔ ایک جگہ اسی کو عدم حرج سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ (الحج: ۷۸)	اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔

حرج، ایسی گنجان جھاڑی کو کہا جاتا ہے جس میں گھسا نہ جا سکے۔ اسی سے حرج کے معنی انتہائی تنگی کے آتے ہیں۔ مطلب یہ کہ شریعت میں ایسی تنگی یا دشواری نہیں ہے کہ اس پر عمل نہ ہو سکے۔ چنانچہ جب کسی کے لئے کوئی عمل سخت دشوار ہو جاتا ہے تو حرج کا رفع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

بعثت بالحنيفة السمحة [1]	مجھے دین حنیف دے کر بھیجا گیا ہے جس میں کہ سہولت اور آسانی ہے۔

قرآن میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ فرمایا۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ (التغابن: ۱۶)	اللہ سے ڈرو جتنی کہ تمہارے اندر استطاعت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْئٍ فأتوا منه ما استطعتم واذا نهيتكم عن شيئ فدعوه [2]	جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کی حد تک اس پر عمل کرو اور جب کسی چیز سے منع کروں تو اس سے باز رہو۔

پوری شریعت کی بنیاد اسی استطاعت اور عدم حرج پر رکھی گئی ہے۔ یہی اصول کمزور کے سلسلہ میں بھی اس نے برتا ہے۔ اس نے بیماری، جسمانی معذوری، ضعیفی، پیری، سفر کی زحمتوں اور مالی مشکلات وغیرہ کی اپنے تمام احکام میں پوری پوری رعایت کی ہے اور

---

[1] مسند احمد ۵/۲۶۶۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فرض الحج مرۃ فی العمر

جس کام کو جس حد تک انسان انجام دے سکے اتنی ہی اس پر اس کی ذمہ داری بھی ڈالی ہے اور جہاں جو حکم اس کی طاقت سے باہر ہو اس سے اسے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ شریعت کے اس اصول کو علامہ ابن حزمؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وکل فرض کلفه الله تعالیٰ الانسان فان قدر علیه لزمه وان عجز عن جمیعه سقط عنه وان قوی علی بعضه وعجز عن بعضه سقط عنه ما عجز عنه ولزمه ما قدر علیه منه سواء اقله او اکثره[1]	ہر وہ فرض جس کا اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف بنایا ہے اگر اس کے ادا کرنے کی اس میں طاقت ہے تو وہ پورا کا پورا اس پر لازم ہوگا۔ اور اگر وہ اس سے بالکلیہ عاجز ہے تو وہ فرض بھی بالکل ہی اس سے ساقط ہو جائیگا لیکن اگر اس کا کچھ حصہ ادا کر سکتا ہے تو جتنا حصہ نہیں ادا ہو سکتا ہے وہ ساقط ہو جائے گا اور جو حصہ ادا کر سکتا ہے اس کا ادا کرنا اس پر لازم ہو جائے گا۔ چاہے وہ تھوڑا سا حصہ ہو یا بڑا حصہ۔

شریعت کا یہ اصول نماز روزہ جیسی عبادات سے لے کر معاشی، سماجی اور سیاسی احکام تک میں کارفرما ہے۔ اسلام میں عقائد کے بعد عبادات کا مقام ہے۔ ان میں بھی نماز کی اہمیت دوسری عبادات سے زیادہ ہے۔ نماز کے لئے طہارت اور پاک صاف ہونا شرط ہے۔ اسی کے لئے وضو اور غسل رکھے گئے ہیں۔ لیکن اگر آدمی وضو یا غسل نہ کر سکے اور یا پانی دستیاب نہ ہو تو حکم ہے کہ تیمم کرلے۔ نماز میں آدمی تھوڑی دیر خدا کے دربار میں کھڑا ہوتا ہے، رکوع اور سجدہ کرتا ہے باادب بیٹھ کر تسبیح و تحمید کرتا ہے۔ یہ دوسرے مذاہب کی عبادتوں اور ریاضتوں سے بہت ہلکی چیز ہے۔ اس پر بھی جو شخص کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے تو اسے بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت ہے۔ اگر بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر اور زیادہ مجبوری میں صرف اشاروں سے یہ فرض ادا کر سکتا ہے۔ نماز پانچ متعین اوقات میں فرض ہے۔ آدمی ان اوقات میں سو جائے یا بھول جائے تو جب بیدار ہو اور یاد آئے

[1] المحلی: ۱/۶۹

یہ فرض ادا کرلے۔ ہاں قصداً کوتاہی جائز نہیں ہے۔ فرض نمازیں مسجد میں امام کی اقتدا میں ادا کی جاتی ہیں۔ امام کو ہدایت ہے کہ وہ کمزوروں کی رعایت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مَنْ اَمَّ قَوْمًا فلیخفف فان فیهم الکبیر وان فیهم المریض وان فیهم الضعیف وان فیهم ذا الحاجة [۱]

جو شخص کسی جماعت کی امامت کرے تو ہلکی اور مختصر نماز پڑھائے۔ اس لئے کہ جماعت میں بوڑھے، مریض، حاجت مند ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

روزے اور برت کی تعلیم ہر مذہب میں موجود ہے۔ مسلسل کئی کئی روز کے برت کا بھی رواج ہے۔ لیکن اسلام نے کہا کہ روزہ صرف طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ہوگا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ صرف ایک مہینہ کا ہوگا زندگی بھر کا نہیں اس کے باوجود جو شخص بیمار ہے یا سفر میں ہے یا جو عورت حمل اور رضاعت کی تکلیف برداشت کر رہی ہے ان سب کو اجازت ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں اس کی قضا کریں۔ جو شخص ضعیف اور پیری کی وجہ سے بعد میں بھی روزہ نہ رکھ سکے تو کسی مسکین کو کھانا کھلا دے۔ یہ اس کا کفارہ ہے۔ روزہ کے سلسلہ کی رعایتوں کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (البقرہ: ۱۸۵)

اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔

زکوٰۃ اسلامی عبادات کا ایک اہم رکن ہے۔ یہ معاشرہ کی مالی اعانت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ لیکن زکوٰۃ ان ہی لوگوں پر فرض ہے جو ایک خاص مقدار میں دولت کے مالک ہوں۔ جن کے پاس اتنی دولت نہیں ہے ان کو اسلام نے زکوٰۃ سے مستثنیٰ

---

[۱] مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب امر الائمہ بتخفیف الصلوٰۃ فی تمام۔ اس مفہوم کی روایتیں صحاح کی اور کتابوں میں بھی ہے۔

قرار دیا ہے۔ یہ اس طرح کا مذہبی ٹیکس نہیں ہے جو ہر شخص کو چار و ناچار ادا کرنا پڑے۔

حج بھی اسلام کی ایک اہم عبادت ہے جس میں آدمی اسلام کے مرکز (مکہ) پہونچ کر روحانی فیض حاصل کرتا ہے۔ اس کے لئے بھی استطاعت شرط ہے۔ اگر استطاعت نہیں ہے تو حج فرض نہیں ہوگا۔ استطاعت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جسمانی طور پر بھی اور مالی لحاظ سے بھی اس لمبے سفر اور وہاں کی تگ و دو کے قابل ہو۔ قرآن میں ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا	اللہ کے لئے لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جو کہ وہاں تک پہونچنے کی طاقت رکھتا ہو۔

خاندانی نظام میں مرد پر مالی ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کے سلسلہ میں اسلام کا اصول اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا اٰتَاهَا سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا (الطلاق: ۷)	خوش حال اپنی خوش حالی کے مطابق خرچ کرے اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا اسے مکلف نہیں کرتا۔ بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے۔

اسلام میں جہاد کا تصور یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے وقت ضرورت جان بھی قربان کرے اور مال بھی۔ لیکن جو شخص جسمانی طور پر معذور ہے اس سے جان لڑانے کا اور جس کے پاس مال نہیں ہے اس سے مال خرچ کرنے کا مطالبہ نہیں ہے۔ ہاں جو شخص استطاعت کے باوجود پیچھے رہے وہ گنہگار ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل آیتوں سے اسلام کا مزاج سمجھا جا سکتا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ	نہ تو ضعیفوں پر، نہ مریضوں پر اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ ہے جن کے پاس

لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔

(التوبہ: ۹۳-۹۱)

خرچ کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کریں۔ (واقعہ یہ ہے کہ) اس طرح کے نیکوکاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ تمہارے پاس اس لئے آئے کہ تم انہیں سواریاں فراہم کردو تو تم نے ان سے کہہ دیا کہ میں تمہارے لئے سواریوں کا انتظام نہیں کرسکتا تو وہ اس غم میں کہ ان کے پاس اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے، اس طرح واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔ الزام تو ان لوگوں پر ہے جو دولت مند ہونے کے باوجود تم سے جہاد میں شریک نہ ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔ وہ خوش ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں میں وہ بھی رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی اور وہ نہیں جانتے۔

صبر کی تلقین

کمزوری جسمانی، مالی، علمی، سیاسی جس نوعیت کی بھی ہو اسلام صبر کی تلقین کرتا ہے۔ دینی اصطلاحات آج اپنی ساری معنویت کھو چکی ہیں۔ لوگوں نے مجبوری

کا نام صبر رکھ چھوڑا ہے۔ اس لئے صبر کا لفظ سنتے ہی بے عملی، پست ہمتی اور حالات کے سامنے سپر انداز ہو جانے اور بے دست و پا بن کر بیٹھ رہنے کا تصور ابھرتا ہے۔ حالانکہ صبر، استقامت اور بلند حوصلگی کا نام ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی حالات کا جم کر مقابلہ کرے اور شکست کھا بھی جائے تو ہمت نہ ہارے اور تازہ دم ہو کر اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھے۔ صبر فتح و کامرانی کی کلید ہے۔ صبر آدمی کو نئی زندگی اور نئی توانائی عطا کرتا ہے۔ صبر کسی ایک میدان میں نہیں، زندگی کے ہر شعبے میں مطلوب ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی زندگی کی اعلیٰ قدروں کو اختیار کرے اور ان کے لئے مسلسل قربانی دے۔ صبر یہ بھی ہے کہ نفس کی خواہشات، خاندان کی غلط روایات، معاشرہ کی بری عادات و اطوار اور اخلاقی خرابیوں کا مقابلہ کرے اور اپنی سیرت پر گندگی کے چھینٹے آنے نہ دے۔ صبر یہ بھی ہے کہ آدمی شدائد و مشکلات میں ثابت قدم رہے اور کوئی ایسا اقدام نہ کر بیٹھے جو اس کو بلندی سے نیچے اتار دے۔ صبر یہ بھی ہے کہ آدمی مصائب و آلام میں ہوش و حواس نہ کھو بیٹھے اور اللہ کے فیصلہ کو خوش دلی سے برداشت کرے۔ جب تک صبر کا وصف نہ ہو آدمی فکری، علمی، اخلاقی، معاشی، سماجی کسی بھی پہلو سے اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ عظمت درحقیقت اس دنیا میں صابروں کے حصہ میں آتی ہے۔

قرآن مجید میں ہر آزمائش اور امتحان کے موقع پر صبر کی تعلیم دی گئی ہے اور اسے دنیا کی کامیابی کے ساتھ آخرت کی کامیابی کا بھی ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی تمام تصریحات یہاں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ صرف تین آیتیں نقل کی جا رہی ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ	ہم ضرور تم کو آزمائیں گے خوف سے، بھوک سے، مالوں، جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔ اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دو جن کا حال یہ ہے کہ جب کوئی تکلیف انہیں پہونچتی ہے تو انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہیں ان پر ان کے رب کی عنایات ہیں اور رحمت ہے اور یہی

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۱۵۵-۱۵۷) ہدایت یافتہ ہیں۔

جن لوگوں کا آخرت ہی پر ایمان نہیں ہے وہ وہاں کی کامیابی اور اجر و ثواب پر بھلا کیا یقین کر سکتے ہیں! وہ اسے محض ایک ایسی جھوٹی تسلی سمجھیں گے جو سادہ لوح عوام کو بہلانے کے لئے دی گئی ہے۔ وہ سمجھیں گے کیا فی الواقع یہی سمجھتے ہیں۔ آخرت کے امکان سے یہاں بحث نہیں ہے صرف ایک پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے وہ یہ کہ آخرت کے اجر و ثواب کا تصور انسان کو محرومی کے احساس سے بچاتا ہے۔ جس شخص کو آخرت پر یقین ہو وہ کبھی دل شکستہ، مایوس اور نا امید نہیں ہوتا۔ وہ بڑے سے بڑے نقصان کو بھی بہتر اجر و ثواب کی توقع پر بخوشی برداشت کر سکتا ہے۔ ورنہ اس دنیا میں جہاں انسان کو ہمت شکن حالات اور دل و دماغ کو ہلا دینے والے صدمات کا سامنا کرنا پڑتا رہتا ہے۔ وہ ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص جو اپنی بینائی کھو چکا ہو اس کے لئے اس دنیا کی ساری رونقیں بے معنیٰ ہیں۔ لیکن اگر وہ اس یقین کے ساتھ جئے کہ آج وہ جس نعمت سے محروم ہے کل نہ صرف یہ کہ وہ اسے عطا کی جائے گی بلکہ بہترین اجر و ثواب سے بھی اسے نوازا جائے گا تو اس محرومی میں بھی وہ سکون اور اطمینان محسوس کرے گا اور ہمت کے ساتھ کارزارِ حیات میں اپنا حق ادا کرے گا۔ ایک شخص جس کا جواں سال اور اکلوتا بچہ کسی حادثہ کی نذر ہو گیا ہو اس کے لئے اس بھری دنیا میں کوئی کشش نہیں ہے ہاں اگر وہ یہ سوچ کر زندگی گزارے کہ اس صدمہ کا صلہ اسے جنت کی شکل میں ملنے والا ہے اور وہاں اس کا بچہ اسے مل بھی جائے گا تو اس نقصان میں بھی اسے نفع کا احساس ہو گا۔ آخرت کا یقین یہی تصور انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔

جد و جہد کی تعلیم

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو شخص اپنی محنت مشقت اور ذاتی جد و جہد سے عزت، جہالت، مرض اور دوسری کمزوریاں دور کر سکتا ہے اسے ہاتھ پیر توڑ کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ عمل اور صلاحیت سے نوازا ہے اس کا اپاہج بن کر زندگی

گزارنا بہت بڑا جرم ہے۔ وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہے کہ آدمی محض اپنی سستی کاہلی اور بے عملی کی وجہ سے معاشرہ پر بوجھ بن جائے اور دوسرے اسے خوشی یا ناخوشی سے برداشت کرتے رہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ آدمی کسی کا دست نگر بنے رہنے یا کاسۂ گدائی لے کر گھومنے کی جگہ محنت مشقت کے ذریعہ آگے بڑھے اور اللہ نے اسے جو صلاحیت دی ہے اس کا بھرپور استعمال کرے۔ خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسرے کو بھی فائدہ پہونچائے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں جو ہدایات ملتی ہیں انہیں یہاں پوری تفصیل سے نہیں پیش کیا جا سکتا البتہ دو چار حدیثیں بیان کی جا رہی ہیں۔

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی درخواست کی۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تیرے گھر کوئی چیز ہے؟ اس نے عرض کیا۔ ایک کمبل ہے۔ جس کا آدھا ہم بچھاتے ہیں اور آدھا اوڑھتے ہیں اور پانی پینے کا ایک پیالہ ہے۔ آپ نے فرمایا یہ دونوں چیزیں لاؤ۔ جب وہ دونوں چیزیں لایا تو آپ نے انہیں نیلام کرایا۔ ایک شخص نے دو درہم میں انہیں خرید لیا۔ یہ دونوں درہم آپ نے اسے دئے اور فرمایا ایک درہم کا کھانا بیوی بچوں کو دے آؤ اور ایک درہم میں کلہاڑی خرید لاؤ جب وہ کلہاڑی لایا تو دست مبارک سے اس میں دستہ لگایا۔ فرمایا جنگل سے لکڑی کاٹ کر بیچو۔ پندرہ دن سے پہلے میرے پاس نہ آنا۔ اس شخص نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا۔ دس درہم کمائے۔ اس سے کپڑا اور غلہ خریدا۔ آپ نے فرمایا بتاؤ یہ بہتر ہے یا یہ کہ تم قیامت کے دن اس طرح اٹھو کہ تمہارے چہرہ پر بھیک کے داغ ہوں [1]

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقات تقسیم فرما رہے تھے کہ دو آدمیوں نے حاضر ہو کر صدقہ کی درخواست کی۔ یہ دونوں بیان کرتے ہیں کہ آپ نے نگاہ اٹھا کر ہم لوگوں کو دیکھا اور پھر نگاہ نیچی کر لی۔ آپ نے جب دیکھا کہ ہم لوگ

---

[1] ابو داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب ماتجوز فیہ المسئلۃ۔

صحت مند اور تندرست ہیں۔ تو فرمایا کہ تم چاہو تو صدقہ تمہیں بھی دے دوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں نہ تو کسی صاحب حیثیت اور پیسہ والے آدمی کا حصہ ہے اور نہ کسی ایسے شخص کا جو تندرست اور کمانے کے قابل ہو۔[۱]

ایک اور مثال لیجئے۔

دین اور دنیا کی کامیابی کا انحصار علم پر ہے۔ علم جس طرح کی ریاضت اور محنت چاہتا ہے اس کا صحیح اندازہ مجھ سے بہتر طریقہ سے وہ اصحاب کر سکتے ہیں جن کی زندگیاں اس مقصد کے پیچھے شمع کی طرح گھلتی رہی ہیں۔ اسلام نے علم کے لئے کی جانے والی کوشش کی اس قدر ہمت افزائی کی ہے کہ اسے جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل اللّٰه[۲]	جو شخص علم کی طلب میں نکلے تو واپس آنے تک وہ اللہ کے راستہ میں ہے

اس سے زیادہ اس راہ میں ہونے والی کوشش کی ہمت افزائی اور کیا ہوگی کہ آپ نے فرمایا جو شخص علم کی تلاش میں نکلے اور اسے حاصل کرے تو اسے دو ثواب ہیں اور حاصل نہ کر سکے تو ایک ثواب ہے۔[۳]

مطلب یہ کہ اس راہ کی کامیابی دوہری خوشی کا باعث ہے اور ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں ہے۔ اس کا اجر و ثواب بھی خدا کے ہاں محفوظ ہے۔ اس طرح اسلام ایک طرف کم زور کی رعایت کرتا اور اسے ممکنہ سہولتیں اور آسانیاں فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف اسے ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس قابل بناتا ہے کہ وہ معاشرہ میں بے کسی و بے بسی کی تصویر نہ بنا رہے بلکہ جاندار اور موثر کردار ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جو قوتیں اور صلاحیتیں دی ہیں ان سے خود بھی بھرپور فائدہ اٹھائے اور معاشرہ کو بھی پورا پورا فائدہ پہنچائے۔

۱۔ ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب یعطی من الصدقۃ الخ۔ نسائی کتاب الزکوٰۃ، باب مسألۃ القوی
۲۔ کتاب العلم، بحوالہ ترمذی و دارمی ۳۔ مشکوٰۃ، کتاب العلم،

ترجمہ و تلخیص

تعدد ازدواج پر پابندیوں کا مسئلہ*

ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری   مترجم : سلطان احمد اصلاحی

ہندوستانی عدالتوں میں نافذ العمل اسلامی شخصی قوانین کے سلسلے میں جن اہم تبدیلیوں کا بار بار مطالبہ کیا جاتا رہا ہے، اور جنہیں از راہ کرم اصلاحات (REFOMS) کا نام دیا جاتا ہے وہ عورتوں سے متعلق ہیں۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں[1] مہاراشٹر کی خواتین کے ایک اجتماع میں جو مشترک طور پر انڈین سیکولر سوسائٹی اور مسلم ست شودھک منڈل کے زیر اہتمام پونا میں منعقد ہوا تھا، مسٹر اے۔ اے۔ اے فیضی نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے اسلامی شخصی قوانین کے تحت مسلمان عورتیں ناگفتہ بہ مصائب سے دوچار رہی ہیں۔ اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت کو جس کے تحت ایک مسلمان بیک وقت چار عورتوں سے شادی کر سکتا ہے، خاص طور پر سخت ترین تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اور اسے عورتوں کے حق میں رسوا کن اور مضرت رساں قرار دیا گیا۔ ہمیں اس پر چنداں تعجب نہیں کہ آج بھی ایسے سادہ لوح لوگ

---

* یہ جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری کے اس انگریزی مقالہ کا ترجمہ ہے جو موصوف کی طرف سے انڈین لا انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام اسلامی پرسنل لا میں اصلاحات کے موضوع پر منعقد سیمینار بتاریخ ۱۴، ۱۵، ۱۶ر جنوری ۱۹۷۲ء میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ موصوف کی مکمل نظر ثانی کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔ (س ۔ ا ۔ ا)

[1] واضح رہے کہ یہ مقالہ اس وقت لکھا گیا تھا جب جناب فیضی ہندوستان کے سیاسی افق پر سیکولرزم کے درخشندہ ستارے کی حیثیت سے چمک رہے تھے۔
(مترجم)

موجود ہیں جو بلاتامل یہ باور کر لیتے ہیں کہ ہندوستان کا ہر مسلمان کم از کم چار عورتوں کا حرم آباد کئے ہوئے ہے۔ ضبط ولادت کے تمام تر تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے لاتعداد بچوں کو پیدا کرتا چلا جارہا ہے اور اس طرح آبادی کے دھماکے کو وقت سے پیشتر حقیقت بناتے پر تلا ہوا ہے جس سے وہ جہاں ایک طرف تو ملک کی غربت اور اس کی بیکاری میں اضافہ کا باعث بن رہا ہے وہاں دوسری طرف حکومت پر قبضہ کرنے کے نقطۂ نظر سے مسلمان اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرنے کے درپے ہے۔ ہم ششدر تو اس وقت رہ جاتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ اچھے خاصے واقف کار حضرات بھی جو بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام میں تعدد ازدواج صرف مباح ہے نہ کہ واجب اور فرض۔ نیز اس سے بھی واقف ہیں کہ مسلمان عام طور پر ایک سے زیادہ شادی نہیں کرتے اور حقیقت واقعہ بھی یہی کہ معاشی طور پر انکے اندر اس کی صلاحیت پائی بھی نہیں جاتی، وہ بھی تعدد ازدواج کو مسلمان بیویوں کی جملہ پریشانیوں اور ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے بلند بانگ دعوؤں کی پشت پر کوئی اعداد و شمار نہیں پائے جاتے۔ کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعدد ازدواج کے تناسب کے سلسلے میں کوئی معلومات ایسی دستیاب نہیں جو کسی جائزے کی بنیاد پر تیار کی گئی ہو۔ یہ بات قطعاً باعث استعجاب نہ ہوگی کہ اگر کبھی کوئی ایسا جائزہ مرتب کیا گیا تو مسلمانوں کی بہ نسبت غیر مسلموں میں تعدد ازدواج کے واقعات کا تناسب زیادہ ثابت ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ مصر جیسے مسلمان ملک میں جب چند زوجگی کے بارے میں ایک جائزہ مرتب کیا گیا تو پتہ چلا کہ وہاں تعدد ازدواج اس حیرت انگیز حد تک کم ہے کہ تیسری اور چوتھی بیوی سے شادی کے واقعات کو اعداد و شمار کی زبان میں بیان کرنا ممکن نہ ہوا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں جب مصری حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ وہ اعداد و شمار کی بنیاد پر چند زوجگی کے سوال پر غور کرے تو اس نے محسوس کیا کہ اس طرح کی شادیوں پر قانونی بندشوں کی کوئی حقیقی ضرورت موجود نہیں۔ نتیجتاً سماجی امور سے متعلق وزارت کو کھلے لفظوں میں یہ اعلان کرنا پڑا کہ مصر میں تعدد ازدواج کا کوئی مسئلہ ہی موجود نہیں۔ جس کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہو۔ عقل اسے باور کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی کہ چند زوجگی کے اس حد تک کم واقعات کو کسی بھی جگہ کی پسماندگی کا ذمہ دار قرار

دیا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ظلم اور ناانصافی، خواہ اس کے واقعات کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں، ان کی طرف توجہ نہ کی جائے اور اصلاح کی کوششوں سے صرف نظر کیا جائے۔ جس بات پر زور دینا مقصود ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان اور تعدد ازدواج کے مسئلے کے بارے میں ہمارا رویہ معقول اور حقیقت پسندانہ ہونا چاہئے۔ اور اس کی بنیاد ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان چند زوجگی کے واقعاتی، اعداد و شمار کے جائزے پر رکھی جانی چاہئے۔ اس طرح کی شادیوں کے محرکات کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے یہ بھی پتہ چلانا چاہئے کہ اگر مسلمان مرد ایک سے زیادہ شادی کرنا چاہتا ہے تو ایسا کرنے پر اسے کیا کوئی حقیقی ضرورت آمادہ کرتی ہے۔ ان ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اگر چند زوجگی کو مناسب نہیں سمجھا جا سکتا تو یہ بھی بتانا چاہئے کہ انھیں شریفانہ طریقے سے شریعت کے دائرے میں محدود رہتے ہوئے کن متبادل طریقے سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ رویہ اپنانا اس لئے لازمی ہے کہ ایک ایسے سماجی اور قانونی مسئلے کو گھٹیا قسم کی سیاست کا آلۂ کار بنائے جانے کے خطرات سے امکانی حد تک محفوظ رکھا جا سکے۔ جسے پہلے ہی سے اسلامی قوانین پر حملہ کرنے کے لئے ایک انتہائی بھونڈے بہانے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

اسلام نے جس تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ وہ عورت کے لئے باعث ننگ و عار ہے اور اس سے انسانیت کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ عورت کے وقار اور اس کے پندار کو مجروح کرنے والی چیز کون سی ہے۔ اس کا کسی مرد کے ساتھ ایک [illegible] طوائف، داشتہ اور رکھیل کی حیثیت سے [illegible] اور رشتہ ازدواج سے باہر ایک ایسے مرد کے ساتھ جنسی تعلقات رکھنا جو اس کا قانونی شوہر نہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ عورت کے عزت و وقار کے مسئلے کا علم بلند کرنے والے اور جن لوگوں کے جذبات کو تعدد ازدواج کے تحت مسلمان عورت کی حالت دیکھ کر شدید ٹھیس پہونچتی ہے وہ کیوں اسی جوش و جذبے کے ساتھ ان ناپاک طور طریقوں، رواجوں اور قوانین کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے جو عورت کو قعر مذلت میں ڈھکیلتے ہیں۔

مجموعۂ تعزیرات ہند غیر شادی شدہ یا بالغ مرد اور عورت کے لئے تو جائز سمجھتا ہے کہ وہ اپنی باہمی رضامندی سے ناجائز جنسی تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔ ہمارے ملکی قانون کی رو سے یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ کیا ناجائز جنسی تعلق ایک عورت کو قعر مذلت میں دھکیلنے کا موجب نہیں بنتا جب کہ بہر حال وہ ہم میں سے کسی کی بہن یا بیٹی ہوتی ہے۔ کیا اسلامی تعدد ازدواج کے خاتمہ کا مطالبہ کرنے والوں نے رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلقات رکھنے کے قانونی جواز کو ہدف ملامت بنانے کے لئے کبھی کوئی ہلکی سی آواز بھی بلند کی۔ علاوہ بریں کیا کوئی شخص اس تاریخی حقیقت کا انکار کر سکتا ہے کہ ہر وہ معاشرہ جس نے قانونی طور پر مکمل یک زوجگی کو نافذ کیا، اس نے صراحتاً یا خاموش رضامندی کے طور پر رشتۂ ازدواج سے باہر رہتے ہوئے طرفین کی باہمی رضامندی سے مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلقات کو مستحسن یا کم از کم جائز قرار دیا۔ (یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ کیسے اخلاقی معیار ہیں جن کی رو سے اسلام کی محدود یک زوجگی تو عورت کے حق میں تنگ اور بربریت ہے لیکن جو عورت سے طوائف، بیسوا، داشتہ اور گرل فرینڈ کی حیثیت سے آزادانہ جنسی تعلقات قائم کرنا روا رکھتے ہیں۔

اسلام کی نظر میں عفت وعصمت اور پاکبازی وپاک دامنی کی اقدار انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسلام نے رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلق کو نہ صرف حرام قرار دیا بلکہ اسے قابل تعزیر وسزا جرم قرار دیا۔ اس نے جنسی تسکین کے ہر ایسے ذریعے اور طریقے کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا جو شوہر اور بیوی کے فطری تعلقات کے علاوہ ہو۔ اور اس کے نتیجے میں اس نے ایک حقیقت پسند مذہب کی حیثیت سے ان احوال وظروف کے پیش نظر جو مرد کو ایک سے زیادہ عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں اسے محدود پیمانے پر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی۔ اسلام محدود پیمانے پر چند زوجگی کو ایک معقول انفرادی اور سماجی ضرورت کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ مذکورہ ذیل صورتوں میں سے کسی ایک یا کئی کی موجودگی میں چند زوجگی ایک سماجی ضرورت بن جاتی ہے۔ فطری حالات وواقعات یا کسی ہنگامی صورت حال مثلاً جنگ کے نتیجے میں اگر عورتوں کی آبادی مردوں

سے مقابلہ میں غیر معمولی طور پر بڑھ جائے تو چند زوجگی وہ واحد ذریعہ ہے جسے اپنا کر جنسی معیار کو گراوٹ سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اور عورتوں اور بچوں کی مناسب دیکھ بھال کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ کسی سماج میں بیوہ اور بے سہارا عورتوں کی تعداد کو کم سے کم تر کرنے کا ایک طریقہ چند زوجگی بھی ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تعدد ازدواج ہی بہتر اور معقول تر حل ہے مثال کے طور پر اگر بیوی بانجھ ہو اور شوہر اولاد کا متمنی ہو یا کسی مسلسل عام یا متعدی بیماری میں مبتلا ہو جانے یا کسی شدید جنسی مرض کا شکار ہو جانے کی وجہ سے یا بار بار طویل وقفوں کے لیے بیمار پڑتے رہنے کے باعث بیوی اپنے شوہر سے جنسی تعلقات قائم رکھنے کے قابل نہ رہے یا فرض کیجئے کہ جنسی لحاظ سے وہ شوہر کے بے جوڑ ثابت ہو رہی ہو جس کے نتیجے میں اس کا شوہر سخت ترین جنسی ناآسودگی کا شکار ہو جائے۔ یا عورت کے کسی جسمانی یا دماغی نقص کی بنا پر یا اس کے بوڑھے ہو جانے کی وجہ سے شوہر کا میلان خاطر اس کی طرف باقی نہ رہے۔ اور یہ اندیشہ ہو کہ اگر شوہر نے اسے طلاق دیدی تو کوئی دوسرا اس سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا اور وہ دنیا میں بے یار و مددگار رہ جائے گی۔ یا طلاق کی صورت میں عورت کے سماجی مرتبے کو کوئی ناقابل برداشت دھچکا لگنے کا خطرہ ہو یا اس کے ذرائع آمدنی پر کاری ضرب لگنے کا اندیشہ ہو۔ اس طرح کی ساری صورتوں میں جن کا استیعاب مقصود نہیں بیوی کا مفاد اسی میں ہے کہ شوہر کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے برقرار رکھتے ہوئے دوسری شادی کر سکے۔ علاوہ بریں دوسری ایسی صورتیں بھی ہو سکتی ہیں جن میں شوہر اپنے ذاتی، جماعتی، خاندانی یا ملکی مفاد کے پیش نظر چند زوجگی کو لوگوں سے مستقل تعلقات قائم کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتا ہو۔

یہ حقیقی ضروریات ہیں۔ اور اسلام کو ان ضرورتوں کا احساس ہے۔ چنانچہ واقعی اور حقیقی ضرورت کے پیش نظر ازدواجی زندگی سے باہر صنفی تعلقات قائم کرنے کی چھوٹ دینے کے بجائے مرد کو اس بات کی اجازت دے کر کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکے۔ دوسرے لفظوں ایسے ایسے مواقع میں ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ قانونی اور ذمہ دارانہ صنفی تعلقات قائم کرنے کو جائز قرار دے کر اسلام نے اپنے ماننے والوں کے

جنسی اور اخلاقی معیارات کو برقرار رکھا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تعدد ازدواج اپنے جلو میں جن گوناگوں مسائل اور امکانی خدشات کو لے کر آتا ہے اسلام ان سے غافل ہے یا انہیں اہمیت نہیں دیتا۔ سورہ نساء کی دو آیتوں (۳ اور ۱۲۹)[1] کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ تعدد ازدواج کی صورت میں یہ عین ممکن ہے کہ شوہر دو یا دو سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل و انصاف اور مکمل مساوات کے تقاضوں کو پورے طور پر ملحوظ رکھنے میں ناکام رہے۔ ظاہر ہے کہ اس ناکامی کے لازمی نتائج خاندانی زندگی میں سخت اختلال، شوہر اور بیویوں، خود بیویوں سے مختلف بیویوں کی اولاد کے درمیان ناگوار اور کشیدہ تعلقات کی شکل میں رونما ہوں گے۔ اس طرح کی ناخوشگوار صورت حال سے بچنے کی خاطر ہی اسلام اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ اگر آدمی کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ ایک سے زائد بیویوں کے درمیان عدل و انصاف اور مساوات کے تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھ سکے گا، تو اسے صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کرنی چاہئے۔ اسلام کو

---

[1] وہ آیات یہ ہیں:

(۱) وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا۔ [نساء۔ ۳] (اور اگر تم کو ڈر ہو کہ لڑکیوں کے معاملے انصاف نہ کرسکو گے تو شادی کرلو جیسا کہ تم پسند کرو عورتوں سے دو دو، تین تین اور چار چار لیکن اگر تم کو ڈر ہو کہ برابر نہ رکھ سکو گے تو ایک یا وہ جو تمہارے ہاتھ کا مال ہیں یعنی لونڈیاں۔ یہ چیز اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم ایک طرف جھک نہ پڑو)۔

(۲) وَلَن تَسْتَطِيعُوا أَن تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۖ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِن تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا۔ (نساء، ۱۲۹) (عورتوں کو بالکل برابر نہ رکھ سکو گے اگرچہ تم ایسا چاہو۔ تو ایک طرف کی اس طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو۔ اور اگر تم بھلائی کی راہ اختیار کرو اور ڈرتے رہو تو بے شک اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے)۔ (مترجم)

دو متبادل صورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

ایک تو یہ کہ بیوی کے ساتھ امکانی ناانصافی اور بچوں کو ممکنہ مضرت پہنچنے کے خدشات کا سدباب کرنے کے لئے یک زوجگی کے حق میں اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور چند زوجگی کو یکقلم ممنوع قرار دے کر فرد نیز معاشرے کی بعض حقیقی اور ناگزیر ضروریات کی رعایت سے یکسر صرف نظر کرتے ہوئے سماج کو فساد اور آبرو باختگی کی ناپاک قوتوں کے حوالے کر دے۔ دوسرے یہ کہ وہ عفت وعصمت اور پاکبازی و پاک دامنی کی اقدار اور جنسیاتی اخلاقی معیار کے تحفظ کی خاطر نیز فرد اور سماج کی بعض حقیقی ضروریات کی تکمیل کے پیش نظر تعدد ازدواج کی اجازت دے۔ چاہے ایسا کرتے ہوئے بیوی اور بچوں کو پہونچ سکنے والے بعض ایسے نقصانات کا خطرہ ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ جن کی ضرر رسانی کو امکانی حد تک کم کرنے کے لئے تعدد ازدواج کی اجازت کو چار تک محدود کر دیا جائے اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے خواہش مند شوہر کو اس کا پابند بنایا جائے کہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ تعدد ازدواج کی صورت میں وہ عدل و انصاف اور مساوات کے تقاضوں کو پورا نہ کر پائے گا تو ایسا کرنے سے احتراز کرے۔ اسلام نے ان دو متبادل راستوں سے دوسرے کا انتخاب کیا اور حق یہ ہے اس سے بہتر کوئی انتخاب ممکن ہی نہیں۔

اسلام نے اس سے آگے بڑھ کر دو ٹوک لفظوں میں (قرآن ۴: ۱۲۹ [1]) یہ بھی بتا دیا کہ تعدد ازدواج کے سلسلے میں عدل و انصاف اور مساوات کے بعض معیار وہ ہیں جن پر پورا اترنا انسان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ یعنی ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں ہر بیوی کے لئے اپنے دل میں محبت والفت کے یکساں جذبات و احساسات رکھنا۔ اس نے مرد کو سختی سے ہدایت دی کہ ایسا نہ ہونا چاہئے کہ کسی مخصوص بیوی سے اس کا قلبی لگاؤ عملی زندگی میں اس کے رویے پر غلط طریقے سے اثر انداز ہو اور دوسری بیویوں سے امتیازی اور ناروا سلوک پر آمادہ کر دے

ہم نہیں سمجھتے کہ اس طرح کا تعدد ازدواج معاشرے یا فریقین کے لئے کسی اعتبار سے ذلت و رسوائی کا سامان ہے۔ ہمیں اس بارے میں نہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہ معذرت

---

[1] یہ آیت اور اس کا ترجمہ ابھی نقل کیا جا چکا ہے۔ (مترجم)

خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی۔ اس کے باوجود ہم ہر اس تجویز پر پوری سنجیدگی سے غور کرنے کیلئے تیار ہیں جس کا مقصد چند زوجگی کی امکانی مضرتوں کو مزید کم سے کم کرنا ہو لیکن شرط یہ ہے کہ یہ تجویز قرآن وسنت کی روح سے جو اسلامی شریعت کی اساس ہیں ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ بہر حال اسلامی تعدد ازدواج کے بارے میں کوئی ایسی تبدیلی یا اصلاح، ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قطعاً ناقابل قبول ہوگی، جو اسے یا تو براہ راست ختم کردے یا بالواسطہ طریقے سے اس پر ایسی پابندیاں عائد کردے جس کے نتیجے میں وہ عملاً ممنوع ہوکر رہ جائے۔ تونس کی حکومت نے تعدد ازدواج کو ممنوع اور قابل تعزیر جرم قرار دے کر یقیناً اسلامی شریعت میں دراندازی کی ہے۔ ہم اس طرز عمل کی تائید کسی طرح نہیں کرسکتے۔ تعدد ازدواج کے اسلامی جواز کو ممنوع قرار دینا اس اجازت کی تہہ میں کارفرما مقاصد کے حصول کے دروازے کو حتمی طور پر بند کر دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی ایسا بدل پایا ہی نہیں جاتا جسے اسلام کی تائید حاصل ہو۔ تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دینا شریعت اسلامیہ میں مداخلت اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں دراندازی کرنا ہے۔ کیونکہ ایسا کوئی اقدام:-

اولاً تعدد ازدواج کو اس قانونی مرتبہ ومقام سے ہٹادے گا جہاں شریعت اسلامیہ نے اسے رکھا ہے۔ کیونکہ اس طرح ایک ایسی چیز خلاف قانون قرار پاجائے گی جسے قرآن وسنت نے واضح طور پر جائز بتایا ہے۔

ثانیاً جن اغراض ومقاصد کے حصول کے لئے یہ اجازت دی گئی ہے ان کے حصول کے لئے کوئی ایسا متبادل ذریعہ جسے اسلامی شریعت جائز قرار دیتی ہو باقی نہیں چھوڑتا۔

ثالثاً جنسی اخلاقیات اور اخلاق عامہ کے ان اعلیٰ معیارات کے حصول کو عملاً ناممکن بنادیتا ہے جن کا قیام اور تحفظ قرآن وسنت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔

تعدد ازدواج کو ممنوع قرار نہ دیتے ہوئے بعض قانونی بندشیں جو کچھ مسلمانوں پر ملکوں کی طرف سے اس پر عائد کی گئی ہیں وہ کچھ اس طرح کی ہیں کہ مرد عدالت کے سامنے دوسری شادی کی واقعی حاجت اور ضرورت کو ثابت کرے۔ یا عدالت کی رضامندی کے ساتھ پہلی بیوی کی رضامندی بھی حاصل کرے۔ یا شوہر یہ ثابت کرے کہ وہ معاشی طور پر

دونوں بیویوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان بندشوں کے عائد کرنے کا مقصد اگرچہ یہ ہے کہ ناانصافی کے خدشات کو مزید کم کیا جا سکے۔ تاہم یہ صد فی صد کامیاب نہیں بلکہ یہ اپنے اندر ایسے بہت سے نقائص اور کمزوریاں رکھتی ہیں جن سے انہیں پاک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ دوسری شادی کسی فرد کے لئے انتہائی ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتی ہو لیکن اسے عدالت کے روبرو پورے طور پر ثابت نہ کیا جا سکے۔ اور اس کی عدم تسکین اسے کسی غیر اسلامی حل کی طرف ڈھکیل دے۔ جہاں تک پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اس سے تعدد ازدواج کی اجازت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اجازت اس خدشے کو تسلیم کرنے کے باوجود دی گئی ہے کہ اس سے کسی نہ کسی بیوی کے جذبات کو ٹھیس پہونچنے کا خطرہ بہرحال موجود ہے۔ کیونکہ اس سے بھی اہم تر انفرادی، سماجی اور جنسی اخلاقی امور کی رعایت مقصود ہے۔ جہاں تک اس کی پابندی کا تعلق ہے کہ دوسری شادی کے خواہش مند شوہر کو پہلے اپنی مالی حیثیت کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے تو یہ تحصیل حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص بیوی کا خرچ برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو قرآن اسے ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنی شادی کو چاہے وہ پہلی شادی ہو یا چوتھی، اس وقت تک ملتوی رکھے جب تک وہ بیوی بچوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ ہو جائے۔ مزید برآں کوئی شادی خواہ وہ پہلی ہو یا دوسری اس بنیاد پر باطل یا فاسد قرار نہیں دی جا سکتی کہ شادی کے وقت شوہر اپنی بیوی کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھا نکاح کو صرف اس صورت میں فسخ کیا جا سکتا ہے جب شوہر بیوی کو نفقہ ادا نہ کرے یا نہ کر سکے اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ خود عورت عدالت سے باضابطہ رجوع کرے جیسا کہ قانون فسخ نکاح اہل اسلام" (BISSO_UTION OF MUSLIM MARRIGE ACT) میں کہا گیا ہے۔ مزید برآں یہ ایکٹ یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر شوہر ایک سے زیادہ بیویاں رکھتا ہے تو کوئی بیوی اس بنا پر بھی علیحدگی طلب کر سکتی ہے کہ شوہر اس کے ساتھ منصفانہ اور مساویانہ سلوک نہیں کر رہا ہے۔ اس قانون کی یہ دونوں دفعات نکاح پر مالی حیثیت کے ثبوت کی مذکورہ بالا بندش سے متوقع افادیت کو بڑی حد تک مشکوک کر دیتی ہیں۔

علاوہ بریں چوں کہ مذکورہ بالا بندشوں میں سے کوئی بھی حتی کہ تونسی حکومت کا وہ قانون بھی جو چند زوجگی کو غیر قانونی اور قابل تعزیر جرم قرار دیتا ہے، دوسری شادی کو باطل قرار دینے کی حد تک نہیں جاتی۔ اس لئے اگر کوئی شخص جرمانہ ادا کرنے یا قید بھگتنے کو تیار ہے یا ان افسران کی جیب گرم کرسکتا ہے جو دوسری شادی کے خواہش مند شوہر کی مالی حیثیت کی تصدیق پر مامور ہیں تو وہ بآسانی اس قانون کی زد سے اپنے کو بچالے جائے گا۔

مزید برآں جب تک کہ یہ دو متضاد چیزیں یعنی قانونی طور پر یک زوجگی کا نفاذ اور ازدواجی زندگی سے باہر جنسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت پہلو بہ پہلو موجود رہیں گی تب تک چند زوجگی کی قانونی ممانعت یا تحدید دونوں یکساں طور پر غیر موثر اور بے معنی ثابت ہوں گی۔ اس صورت حال میں اگر کوئی مرد جو دوسری بیوی کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو وہ ان راستوں میں سے جو قانونی طور پر اس کے لئے کھلے ہونگے، کسی ایک پر چلنے کے لئے مجبور ہوگا۔ قانونی طور تو وہ ایک بیوی کا پابند ہوگا مگر اس کے ساتھ وہ یا تو رشتۂ ازدواج سے باہر مختلف ایسی عورتوں کے ساتھ عارضی طور پر صنفی تعلقات قائم کرتا رہے گا جو اس کے لئے رضا مند ہوں۔ یا جتنی عورتوں کو اس کا جی چاہے گا اپنی معاشی حیثیت کے مطابق مستقل طور پر طوائف، داشتہ، رکھیل، گرل فرینڈ کی حیثیت سے رکھیگا۔ دونوں میں سے ہر صورت اس کی قانونی بیوی کے لئے ذہنی اذیت اور کرب کا سامان بنے گی۔ دوسری عورتوں کے لئے ذلت و رسوائی کا باعث ہوگی۔ گندے جنسی امراض پھیلانے اور حرام اطفال کو جنم دینے اور پرورش کرنے کا سبب بنے گی۔ اس صورت حال سے نپٹنے کا کوئی شریفانہ راستہ ہے ہی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ سارے ان سماجوں نے جنھوں نے قانونی طور پر تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا انھوں نے مجبور ہو کر اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ ناپاک جنسی زندگی کو سند جواز عطا کی ساتھ انتخاب صرف دو صورتوں میں سے کسی ایک کا کرنا ہے۔ ایک طرف تو وہ شریفانہ تعدد ازدواج جس پر اخلاقی پابندیاں عائد ہیں اور جس کا قائل اسلام ہے۔ اور دوسری طرف وہ حرام کاری اور جنسی انارکی ہے جسے قانون روا رکھتا ہے۔ یہ بات بلا وجہ نہیں کہ آج تک کسی مذہبے

چند زوجگی کو ختم نہیں کیا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اسے چار کی تعداد تک محدود کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات تک میں یہ چیز نہیں ملتی۔ یہ تو جب مسیحیت میں سینٹ پال کے جنس دشمن اور عورت بیزار خیالات ٹھونس دئے گئے اس کے بعد ہی تجرد اور کنوارپن مثالی طریق زندگی قرار پایا۔ اور جنسی جذبات کو کچل ڈالنا صالح ترین عمل سمجھا جانے لگا۔ پال کی ایجاد کردہ مسیحیت نے مرد کو ایک بیوی رکھنے کی اجازت بھی بڑی ہچکچاہٹ بلکہ اکراہ کے ساتھ دی۔ اس میں شک نہیں کہ حد سے بڑھا ہوا جنسی توغل اور انہماک انسانی زندگی کو پستیوں میں ڈھکیل دیتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ صحت مند جنس کی پامالی ہمیشہ جنسی انارکی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ پال کی تعلیمات کے جنسی جذبات کو کچلنے کے نتائج بھی یہی نکلے۔ آج مسیحی ممالک جنسی انارکی کے جس طوفان کی لپیٹ میں ہیں اس کی ذمہ داری بڑی حد تک پال کی انھیں تعلیمات کے سر ہے۔ چند زوجگی کا خاتمہ کرکے ان تباہ کن نتائج کو ہندوستان میں دعوت دینا عقل و دانش کا تقاضا ہرگز نہیں ہے۔

تاہم اگر فرد اور معاشرے کی واقعی ضروریات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہندوستان میں بالفرض تعدد ازدواج کا خاتمہ کر بھی دیا جائے تب بھی یہ چیز مطلوبہ اثرات دکھانے سے قاصر رہے گی۔ علاوہ معدودے چند لوگوں کے جن کے دل میں اپنے مذہب اور مذہبی احکام کا کوئی لحاظ اور پاس باقی نہیں رہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے عمومی طور پر ازدواجی زندگی سے باہر عارضی یا مستقل جنسی تعلقات قائم کرنے کی راہ اختیار کرنا مشکل ہی ہوگا۔ لیکن وہ مسلمان جن کو واقعی طور پر اس کی ضرورت ہوگی وہ بڑی آسانی کے ساتھ اس قانونی ممانعت کی زد سے بچنے کی راہ نکال لیں گے۔ اسلام کے نزدیک نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں مرد اور عورت کے باہمی ایجاب و قبول سے منعقد ہو جاتا ہے۔ رجسٹریشن انعقاد نکاح کی شرط نہیں۔ وہ مسلمان مرد جو دوسری شادی کی ضرورت محسوس کر رہا ہے ایک بیوی تو وہ رکھے گا جو ملکی قانون کی رو سے اس کی قانونی بیوی ہوگی اور اس کے ساتھ ایک دوسری عورت سے خالص اسلامی طریقے سے شادی کرے گا۔ جہاں تک اس کے

مذہب کا تعلق ہے دوسری عورت اس کی باقاعدہ بیوی ہوگی، اگرچہ ملکی قانون کی نگاہ میں اس کی داشتہ یا گرل فرینڈ ہوگی۔ اور کیونکہ رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلقات قائم کرنا قانون کی نظر میں روا ہے اس لئے وہ اس طرزِ عمل کے سامنے بے بس ہوگا۔ یہ اعتراض بالکل لغو ہے کہ اس صورت میں وہ دوسری عورت اور اس کے بچے قانونی تحفظ سے محروم رہے ہیں گے اور اس طرح یہ چیز اس طرزِ عمل کے لئے مانع بنے گی۔ ایک داشتہ بھی جسے کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں ہوتا اپنی ذات اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنا جانتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ ناموافق حالات میں جو عورت دوسری بیوی بننے پر آمادگی ظاہر کرے گی، اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایسے نکاح کے انعقاد سے پہلے جسے ملکی قانون کا تحفظ حاصل نہیں وہ کسی نہ کسی طریقے سے اپنے مفادات کا تحفظ کرے گی۔ جہاں تک بچوں کے تحفظ کا سوال ہے تو آج کل کی دنیا ناجائز بچوں کو قانونی تحفظ دینے پر رضامندی ظاہر کر چکی ہے۔ اور جلد یا بدیر خود ہمارے ملک میں بھی یہی ہونے والا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس طرح کے قانون کو دھوکا دینا کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ معاشرے اور خود قانون کا مفاد اسی میں ہے کہ قوانین کو احترام کی نظروں سے دیکھا جائے اور ان کی پیروی کی جائے۔ نہ کہ ان کو حقارت سے دیکھا جائے اور ان سے بچ نکلنے کی تدبیریں کی جائیں۔ جیسا کہ کوتاہ بیں قانون سازی کا ناگزیر مقدر ہوا کرتا ہے۔

تاہم یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ تسلیم کر لینے کے بعد آخر اس میں کیا حرج ہے کہ خود اسلام نے تعدد ازدواج پر جو اخلاقی پابندیاں عائد کی ہیں انھیں قانونی پابندیوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اخلاقی اور قانونی پابندیوں میں سے ہر ایک کا مزاج ایک دوسرے سے علٰحدہ ہے۔ اخلاقی احکام ان صورتوں کے لئے دئے جاتے ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ قانونی احکام کی رسائی وہاں تک ممکن نہیں اور نہ وہ موثر ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں اخلاقی احکام کی خلاف ورزی کی سزا قانونی احکام کی خلاف ورزی کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت اور دور رس ہوتی ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب کہ یہ اخلاقی احکام مذہب کی طرف سے دئے گئے ہوں۔ اب اگر ہم یہ دیکھیں کہ کوئی مذہب جو

کسی خاص معاملہ میں جہاں وہ انتہائی آسانی کے ساتھ قانونی حکم دے سکتا تھا، محض اخلاقی ہدایت پر اکتفا کرتا ہے تو اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ ان معاملات کے بارے میں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس حکم کے صرف ظاہری تقاضوں کو پورا کر دینے سے اس کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ آدمی ان ظاہری تقاضوں سے آگے بڑھ کر پورے احساس ذمہ داری اور پھر پورا اخلاقی احساس کے ساتھ اس کام کو انجام دینے پر آمادہ ہو۔ اس طرح کے نازک معاملات میں محض ظاہری قانونی پابندیاں عائد کرنا ایک امر لاحاصل ہے کیونکہ ایسا شخص جس کا ضمیر مردہ ہے اور جو اخلاقی حس سے بیگانہ ہے بڑی آسانی کے ساتھ قانون کو دھوکا دے دے گا۔ تعدد ازدواج کے خواہش مند پر جو اخلاقی پابندی عائد کی گئی ہے کہ ایسا کرنے سے پہلے وہ اپنے آپ کو تول لے کہ اس بارے میں اس کے اندر عدل و انصاف کی صلاحیت اور اس کے لئے آمادگی کس درجہ میں پائی جاتی ہے۔ تو یہ ایک ایسا داخلی عمل ہے جس کا احتساب خود اس کے اپنے ضمیر کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اخلاق سے عاری ایک شخص پر اگر مالی حیثیت کی تصدیق کی قانونی بندش عائد کر بھی دی جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ عین اس تصدیق کے عمل کے دوران ہی وہ اپنے ذہن میں ایسے منصوبے ترتیب نہ دے رہا ہو کہ بیوی کو کس طرح اذیت ناک مظالم کا نشانہ بنانا ہے، ازدواجی زندگی کے ان مظالم کا نشانہ جن کے کرب و الم سے شوہر اور بیوی کے علاوہ کوئی دوسرا کبھی واقف نہیں ہو پاتا۔

انسانی زندگی میں قانون کی اہمیت کے بارے میں جتنا کہا جائے کم ہے۔ انسانی سماج کے لئے یہ چیز تباہی کا موجب ہوگی کہ قانون کو اس کا جائز مقام دینے سے پہلو تہی کی جائے۔ اس کے باوجود ایک حقیقت ہے کہ انسان کے اہم ترین حقوق جو انسانیت کی عزیز ترین متاع رہے ہیں ان کی رہبری کبھی قانونی احکام نے نہیں کی۔ ان حقوق کی راہبری کا سہرا صرف انسانی ضمیر، اخلاقی ذمہ داری اور احساس فرض کے سر رہا ہے۔ ووٹ دینے کے حق کو اگر بدنیتی اور شرپسندی کے جذبے سے استعمال کیا جائے تو معاشرہ ناقابل انکار بلاؤں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ لیکن سر پھرے ڈکٹیٹروں اور فوجی طالع آزماؤں کے سوا اور کون ہے جو لوگوں کو اس حق

سے سرے سے محروم کرنے، یا اس پر کڑی پابندیاں لگا کر اس کا گلا گھونٹنے کی بیجا حرکت کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ قانون ہرگز اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ ووٹ کے حق کا استعمال منصفانہ اور صحیح ہوگا۔ قانون اس وقت حرکت میں آئے گا جب ووٹ غلط طریقے پر استعمال ہو چکا ہوگا۔ اس طاقت ور حق کے مناسب استعمال کی طرف رہنمائی تو فقط اس حق کے مالک کی تربیت وتعلیم کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح تعدد ازدواج کے حق کے سلسلے میں صحیح طریقۂ کار یہی ہے کہ مسلمان مرد کی تربیت وتعلیم کی طرف توجہ کی جائے۔ اس کی اخلاقی حس کو پروان چڑھایا جائے۔ اس کے اندر زندگی کے بارے میں ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ وہ قانونی احکام جن کے ذریعے ایک عورت مرد کو دیے ہوئے تعدد ازدواج کے حق کے غلط استعمال کی صورت میں اپنا تحفظ کر سکتی ہے، اس وقت بھی موجود ہیں یعنی طلاق تفویض (مرد اپنا حق طلاق عورت کے سپرد کر دے) نیز عورت کا یہ حق کہ وہ فسخ نکاح کا دعویٰ کر سکتی ہے اگر شوہر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں ان کے درمیان عدل وانصاف اور مساوات کے تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھتا ہو۔

سید جلال الدین عمری

سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی دو اہم تصانیف

۱۔ انسان اور اس کے مسائل۔ قیمت تین روپیے۔

انسان کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ ان مسائل کو اسلام نے کس طرح حل کیا ہے؟ اور موجودہ دور اس حل کو قبول کرنے کے لیے ابھی تک کیوں نہیں آمادہ ہے؟ یہ کتاب ان ہی سوالات کا عصری اسلوب اور شگفتہ انداز بیان میں جواب دیتی ہے۔

۲۔ خدا اور رسول کا تصور (اسلامی تعلیمات میں) ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت ۶/۰۰

خدا کی ذات وصفات، اس کی وحدانیت، کائنات سے اس کا تعلق، رسول کی ضرورت اس کے دعوائے رسالت، اس کے دلائل اور آخری رسول کی رسالت کے بارے میں جو پیچیدہ سوالات پیدا ہوتے ہیں اس کتاب میں قرآن مجید اور علم کلام کی روشنی میں ان کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ملنے کا پتہ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی-۶

تعارف وتبصرہ

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

برادرم مکرم جناب محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی نے میری کتاب 'معروف ومنکر' کا مذکورہ بالا عنوان سے بہت ہی شستہ عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ کویت سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ محض اللہ کا فضل واحسان ہے کہ عالم عربی میں اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک سال سے کم عرصہ میں اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ کتاب کے ناشر نے اس پر جو نوٹ لکھا ہے وہ دراصل کتاب کا ایک طرح سے تعارف ہے۔ برادرم سلطان احمد صاحب اصلاحی نے اس کا ترجمہ کیا ہے جو ذیل میں دیا جاتا ہے۔

(جلال الدین)

استاذ سید جلال الدین عمری نائب صدر ادارۂ تصنیف جماعت اسلامی ہند نے اپنی اس کتاب میں 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے قرآنی حقائق ومعارف سے شادکام کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سے ایک طرف کتاب کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوا ہے تو دوسری طرف مصنف کی جلالت علمی کا پتہ چلتا ہے۔

دعوت اسلامی کی اصل غرض وغایت 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' ہے لیکن اس کے مفہوم ومدعا کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمان اس کی غرض حیثیت اور اور اس کی روح سے غافل ہیں اس کا تو کہیں ذکر ہی نہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض پوری شریعت کا نفاذ بھی چاہتا ہے۔

اسی طرح قرآن نے 'دعوت الی الخیر' یعنی بھلائی کی طرف بلانے اور بھلائیوں کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جو حکم دیا ہے اس کا مفہوم بھی

لوگوں کی نظروں میں انتہائی محدود ہے۔ اس کے دائرے میں ان کے نزدیک بس صدقات ونوافل اور ان جیسے چند اعمال آتے ہیں۔ اس سے زیادہ کا وہ تصور نہیں کرتے۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ خیر کے معنی بہت وسیع ہیں، حتیٰ کہ جہاد بھی اس میں شامل ہے۔ اس نکتہ آفرینی کی تو انگشت ہی داد دینی پڑے گی کہ معروف ومنکر کا اطلاق شرک اور توحید پر بھی ہوتا ہے بلکہ توحید سب سے بڑا معروف اور شرک سب سے بڑا منکر ہے۔

یہ بات نہیں ہے کہ کتاب میں جدت پسندی ہے اور سلف سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ مصنف نے جو کچھ کیا ہے وہ یہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذیل میں علماء امت کی طرف سے جو باتیں منتشر انداز میں کہی گئی ہیں انہیں ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیا ہے۔ لیکن ان کی مہارت اور باریک بینی ہے کہ وہ ان انمول موتیوں کو پوری طرح منظر عام پر لانے میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے اس اصطلاح کے مختلف معانی پر غور کر کے، ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کر اس سے مسائل کا اس طرح استنباط کیا ہے کہ پڑھنے والا اپنے ہاتھ میں ایک انتہائی مرتب اور مدلل چیز پاتا ہے جس کے اندر مسائل ایک ایسی عمدہ ترتیب کے ساتھ زیر بحث آئے ہیں کہ اس کے دل ودماغ میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ کسی مقام پر کوئی الجھن اور تشنگی محسوس نہیں کرتا۔

اس کے ساتھ ہی ہم اس کتاب کے مترجم جناب محمد اجمل ایوب اصلاحی کو بھی خراج تحسین پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے جنھوں نے مصنف کے خیالات کو عربی کا قالب عطا کرنے کا حق ادا کر دیا ہے کہ آدمی بس پڑھتا چلا جاتا ہے اور اسے کہیں پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ترجمہ اس قدر مربوط ہے اور زبان وبیان کی نزاکتوں کا اس قدر لحاظ رکھا گیا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ خود کسی صاحب زبان کے ترشحات قلم ہیں۔ اور جس کی نظر زبان وبیان کی باریکیوں اور اس کی ایک ایک ادا پر ہو۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عالموں کے علم، مخلصوں کے عمل اور سچوں کے اجر سے فائدہ پہونچائے۔ مترجم نے اس قیمتی ہیرے کو بہت ہی شاندار اور عمدہ لباس میں پیش کیا ہے۔ اصل کتاب "معروف ومنکر" کے ملنے کا پتہ: مکتبہ اسلامی دہلی ۶ ضخامت ۲۱۶ - قیمت: 6/50

تجلیاتِ حق

وجودِ خدا کا اثبات قرآن وسائنس کی روشنی میں

از الطاف احمد اعظمی (علیگ)

صفحات ۳۴۸

ناشر: مرکز تحقیقات واشاعت علوم قرآن۔ جون پور۔ قیمت پندرہ روپیہ

ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی کی یہ پہلی کتاب ہے جو منظرِ عام پر آئی ہے۔ کتاب کا موضوع جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے قرآن وسائنس کی روشنی میں خدا کا اثبات ہے۔ اس کتاب کے لکھنے کا محرک مصنف نے اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے:

"اصل کتاب کے لکھنے کا محرک دراصل میرا مطالعۂ قرآن ہے۔ دورانِ مطالعہ میں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ قرآن اپنی ہر بات نہایت ہی مضبوط دلائل کے ساتھ بیان کرتا ہے، اور اس کے ان دلائل کا بیشتر تعلق انفس وآفاق کے ان ناقابلِ تغیر حقائق سے ہوتا ہے جن سے یہ پوری کائنات معمور ہے۔ حتیٰ کہ عقائد کی تعلیم میں بھی وہ کوئی بات بغیر کسی دلیل کے نہیں کہتا۔ وہ خدا کی ذات پر صرف ایمان لانے کی دعوت ہی نہیں دیتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ کیوں اس کا مستحق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ (دیباچہ ص ۔ ۱۳)

اس میں شک نہیں کہ کتاب جس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ کتاب دیباچہ کے علاوہ چھ بڑے عنوانات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں کتاب کے اصل مخاطب کے عنوان سے بہت معلومات افروز اور بصیرت افروز بحث کی گئی ہے۔ اور جدیدیت زدہ طبقہ جو سائنس کی خیرہ کن معلومات سے مرعوب ہو کر انکارِ خدا کی راہ پر لگ گیا ہے، مصنف نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اس کی نارسائی کو بے نقاب

کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خاص طور پر کمپیوٹر، ٹیوب بے بی اور خلائی سفر کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس کی بہت سی حیرت انگیز ایجادات کا ذکر کرکے خالق کائنات کی پیدا کردہ بظاہر بہت ہی سادہ لیکن انتہائی پر پیچ اشیاء کے بالمقابل ان کی کم مائگی اور محدودیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مطالعۂ حقیقت کے ذرائع کے تحت فلسفہ، سائنس اور مذہب پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد وجود خدا کے دلائل سے کتاب کا اصل حصہ شروع ہوتا ہے جس میں دلائل آفاق اور دلائل النفس کے عنوان کے تحت بہت ہی جامع اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور آخر میں دلائل قرآن کے عنوان سے پہلے قرآن ہی سے اس کی ازلیت و حقانیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ پھر مثالوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کے متعلق اس کے اشارات کی جدید سائنسی تحقیقات تائید کرتی ہیں۔

قرآن نے انسان کو اپنے مالک و مولیٰ اور رب کائنات کی طرف متوجہ کرنے کے لئے بار بار اور بہت ہی کثرت سے آفاق و النفس کی نشانیوں کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ چیزیں بذات خود قرآن کا موضوع نہیں ہیں اس لئے ان کے سلسلے میں اس نے بہت ہی اجمالی گفتگو کی ہے۔ البتہ پیرایہ بیان اس نے ایسا اختیار کیا ہے کہ ہر دور کا انسان عرفان حق حاصل کر سکتا ہے جو قرآن کا اصل مقصد ہے۔ مصنف نے آفاق والنفس سے متعلق قرآن کے ان ہی اشارات کو جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ذرا تفصیل سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد اس میں شک نہیں کہ آدمی کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ مصنف اردو کا بہت ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور تحریر میں پختگی ہے۔ اس لئے خشک سائنسی معلومات کے بیان میں بھی ایک طرح کی ادبی چاشنی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ بڑی بات یہ ہے کہ اس تحریر میں خون جگر کے ساتھ سوز دروں بھی شامل ہے اس لئے پڑھنے والا بھی اپنے کو اس کیفیت سے سرشار پاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اعتدال و توازن کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا ہے۔ مصنف نے یہ کتاب مطب کی بے جوڑ مصروفیات کے دوران لکھی ہے۔

جس کی وجہ سے وہ علمی حلقہ کی طرف سے بجا طور پر حوصلہ افزائی اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حوالے زیادہ تر نامکمل اور ثانوی ہیں جس میں غالباً زیادہ دخل مصنف کی عدیم الفرصتی اور وسائل کی کمیابی کو ہوگا۔ اگر کتاب اوریجنل حوالوں سے آراستہ ہوتی تو اس کے وزن میں اضافہ ہوتا۔ اس کے علاوہ اصل مآخذ تک رسائی کے نتیجے میں مصنف کے استخراج و استنباط میں مزید گہرائی پیدا ہونے کی بھی توقع تھی۔ بہرحال اگلے ایڈیشن میں یہ کمی دور ہو جانی چاہیے۔ مضامین میں خطابت کی آمیزش بہت معتدل ہے البتہ 'بیں' کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے جو شاق گذرتا ہے۔ 'نہ ہی' کا استعمال بھی بہت کیا گیا ہے۔

اردو میں 'نہ ہی' انگریزی اسلوب 'NOR' کا چربہ ہے جس کی زد سے اگرچہ اب اخبارات و رسائل تو محفوظ نہیں ہیں۔ تاہم اگر معیاری کتابوں کو اس سے محفوظ رکھا جائے تو بہتر ہے۔ ص ۲۳۹ پر فخر الدین علی احمد مرحوم کو ہندوستان کا چوتھا صدر جمہوریہ لکھا گیا ہے حالانکہ چوتھے صدر جمہوریہ وی، وی، گری تھے۔ ص ۲۰۳ پر ORIGIN OF SPECIES کا ترجمہ 'آغاز انواع' کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کا ترجمہ 'اصل الانواع' متعارف ہے اسی طرح ص ۸۸ پر DISCOVERY OF INDIA کا ترجمہ 'انکشاف ہند' کیا گیا ہے۔ حالانکہ 'تلاش ہند' کے نام سے عرصہ ہوا اس کا ترجمہ چھپ چکا ہے۔ سائنسی مباحث میں بھی کہیں کہیں بیجا طول محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح ص ۲۲۲ پر قیامت کی ارتقائی توجیہہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: "مستقبل اپنی تابناکیوں کے ساتھ اندھیرے بھی رکھتا ہے، کیونکہ یہ انسان کے ذہنی ارتقاء کا ایک مرحلہ ہوگا جس کے بعد ارتقائی عمل ختم ہو جائے گا۔ اور اسی کا نام قیامت ہے۔" سوال یہ ہے کہ قرآن و سنت سے اس کے حق میں کیا دلیل پیش کی جا سکتی ہے؟۔ بہرحال یہ معمولی فرو گذاشتیں ہیں جن سے کتاب کی اصل قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور ہم اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ کتاب کے سائنسی مباحث کا اصل لطف تو سائنس کے طالب علم ہی اٹھا سکیں گے۔ خالص اسلامیات کا

ذوق رکھنے والے شاید ان مباحث کو پوری طرح appreciate نہ کرسکیں تاہم ان کے لئے بھی ان مباحث کا مطالعہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ مصنف نے طب کی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود قرآن سے اپنے شغف کا یہ حاصل مطالعہ پیش کیا ہے۔ جو ہر طرح سے قابلِ ستائش ہے۔

اگر آپ اسلام کے بنیادی عقیدوں توحید، رسالت اور آخرت کو علمی اور فکری سطح پر خود سمجھنا اور اپنے دوستوں کو سمجھانا چاہتے ہیں تو مولانا سید جلال الدین عمری کا انگریزی کتابچہ ISLAM—THE UNIVERSAL TRUTH ضرور مطالعہ کریں۔ اس کتابچہ میں بڑے مدلل انداز میں اسلامی عقائد کی حقانیت ثابت کی گئی ہے

قیمت: ۳/۰۰ زیادہ سے زیادہ طلب کرنے پر زیادہ سے زیادہ کمیشن۔

منیجر

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور روڈ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱